اشاعت کے 57 سال

عوامی جمہوریت

اپریل۔مئی 2026

ایران و فلسطین کے محنت کش عوام کی ایک ہی آواز

ہم ڈبودیں گے سرمایہ پرستی کا سفینہ

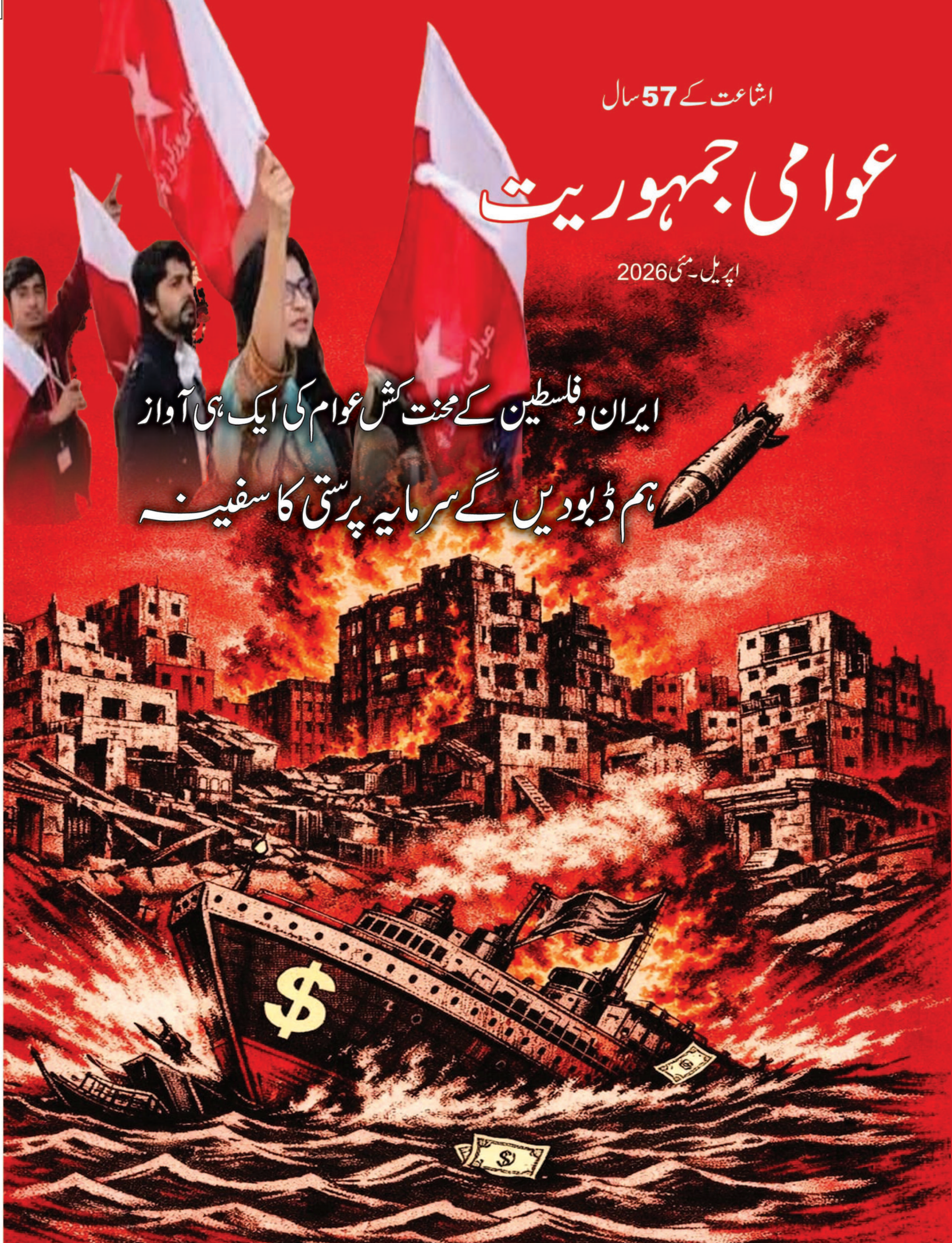

عوامی ورکرز پارٹی کراچی کمیٹی کا اجلاس

عوامی ورکرز پارٹی کے مرکزی صدر اختر حسین کی قیادت میں اپنے رہنما عابد حسن منٹو سے ملاقات

دیپالپور میں یومِ مئی کے موقع پر جلسہ

راولپنڈی میں ڈاکٹر شاہجہاں کی قیادت میں یوم مئی کا پروگرام

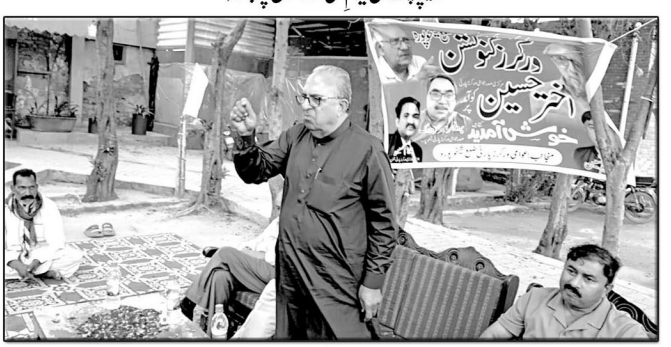

مرکزی صدر اختر حسین ورکرز کنونشن سے خطاب کر رہے ہیں

یوم مئی کے موقع پر مرکزی صدر اختر حسین کا کے الیکٹرک کے ورکرز سے خطاب

عوامی ورکرز پارٹی کے مرکزی جنرل سیکریٹری فرحت عباس ملتان میں یوم مئی کی ریلی کی قیادت کر رہے ہیں

عوامی ورکرز پارٹی بلوچستان میں عبداللہ صافی یومِ مئی کی ریلی کی قیادت کر رہے ہیں

عوامی ورکرز پارٹی سانگھڑ کی جانب سے یوم مئی کی شاندار ریلی کے مناظر۔ ریلی کی قیادت عوامی ورکرز پارٹی سندھ کے صدر کامریڈ قاضی علی نواز نظامانی، عوامی ورکرز پارٹی کے مرکزی نائب صدر کامریڈ پروفیسر میر حسن سریوال، ضلع صدر کامریڈ عبدالقیوم لانڈر، جنرل سیکریٹری کامریڈ عظیم رونجھو، کامریڈ خلیل بلوچ کی قیادت میں نکالی گئی

MONTHLAY
AWAMI JAMHURIAT
LAHORE
ماھنامہ
عوامی جمہوریت
لاھور
CPL No 279

شمارہ نمبر۔2
جلد نمبر۔21
اپریل/مئی 2026
قیمت:100 روپے

مدیر اعلیٰ
اختر حسین
مجلس ادارت
صباالدین صبا
پروفیسر شاہ جہاں، پرویز فتح
اثر امام، پروفیسر حمزہ ورک، دلاور عباس
مینجنگ ایڈیٹر
حسن جاوید
سرکولیشن مینجرز
اشتیاق اعظمی/ناصر نوشاد

اداریہ	ادارہ	1
ریاستی اسلام اور پاکستانی سیاست......پروفیسر امیر حمزہ ورک		3
پاکستان کی گرتی ہوئی معیشت	زاہد پرویز	8
کارل مارکس کا نظریہ بیگانگی	اثر امام	10
نظریاتی، سیاسی، تنظیمی جرٔت......	رانا اعظم	13
ترقی پسند سیاست کے بدلتے زاویے	منظر گردیزی	16
ن۔م راشد کی شاعری......	ڈاکٹر امتل ضیاء، ڈاکٹر شیر علی	18
پاکستان میں بائیں بازو کا احیاء	صباالدین صبا	22
تنظیم سازی کا پڑاؤ	حیدر اخوندزادہ	24
پاکستان اور بلوچستان	تحریر: محمد نسیم رنزوریار	26
یکم مئی 1886 اور یکم مئی 2026 بدلتے حالات، برقرار مسائل		27
اجلاس فیڈرل کمیٹی۔فیصلہ جات	ادارہ	28
عوامی ورکرز پارٹی کا اعلامیہ	ادارہ	30
بلوچستان کو......	کامریڈ حیدر خوجہ	31
عوامی ورکرز پارٹی کی طرف سے کھلا خط	ادارہ	32

لاہور آفس 5 میکلوڈ روڈ
فون:042-37353309-37357091
فیکس:94-42-36361531
کراچی آفس:201-204 پینوراما سینٹر نمبر 1 فاطمہ جناح روڈ صدر کراچی
Email:awami.jamhuriat@gmail.com

اداریہ

یوم مئی اور شکاگو کے جیالے

(۱۸۸۶ء۔۲۰۲۶ء)

مئی ۱۸۸۶ء میں شکاگو کے مزدوروں کی تحریک کے نتیجے میں آٹھ گھنٹے کے اوقات کار منوانے اور اس تحریک کی فتح کی یاد، تو آج ساری دنیا میں منائی جارہی ہے اور سرمایہ دارانہ حکومتوں نے عام تعطیل کا بھی اعلان کر دیا ہے مگر آج محنت کشوں کے اوقات کار کے حالات اور استحصال کی صورتیں انتہائی گھمبیر شکل اختیار کر چکی ہیں۔

شکاگو کے مزدوروں کی وہ تحریک کوئی وقتی اُبال، خودرو، مقامی جدوجہد یا حادثاتی ابھار نہیں تھی بلکہ اس تحریک کا ایک تاریخی تسلسل تھا جس کے تانے بانے دنیا کی مزدور تحریکوں سے جڑے ہوئے تھے جس کو پوری طرح سمجھنے اور اس کی عظمت کو جاننے کے لیے ان تمام تحریکوں کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام کی تیز رفتار ترقی نے سب سے پہلے انگلستان میں محنت کش عوام پر فوری اور گہرا اثر ڈالا سرمایہ داری کی اس جنم بھومی میں ہی سرمایہ داری کو دفن کرنے والے گورکن پیدا ہوئے۔ جتھوں کی شکل میں مزدور تنظیمیں بننے لگیں۔ ۱۸۳۴ء تک انگلستان میں عام مزدوروں کو انجمن سازی کی اجازت نہیں تھی کارخانے میں تنازعہ کی صورت میں، تنازیاعتی کمیٹی تشکیل دے لیتے، رفتہ رفتہ یہ کمیٹیاں زیر زمین جماعتوں کی شکل اختیار کرنے لگیں اور ایک جدوجہد کے بعد انجمن سازی کی قانونی اجازت مل گئی اور ۱۸۴۰ء میں ایک بڑی تنظیم ''نیشنل ایسوسی ایشن فار دی پروٹیکشن آف لیبر'' قائم کر دی گئی جس کے پانچ لاکھ ممبر تھے اور یہ تنظیم ایک طرح سے پہلی فیڈریشن کی شکل تھی۔ اس دور میں مزدور طبقے اور خاص کر جس کے پاس کوئی جائیداد نہیں تھی اس کو حقِ رائے دہی اور پارلیمانی انتخابات میں حصہ لینے کا حق بھی نہیں تھا جس کے خلاف ۱۹۳۷ء میں محضری تحریک Chartist Movement دستخطی مہم کا آغاز ہوا، اس تحریک کے چھ نکات تھے، یہ مزدور طبقے کی وسیع تر سیاسی تحریک تھی، اس تحریک کا خاص مقصد مزدوروں کے لیے حق رائے دہی، خفیہ بیلٹ پیپر کا طریقہ، مساوی انتخابی حلقے، پارلیمنٹ کی رکنیت کے لیے ملکیت کی شرط کا خاتمہ، پارلیمنٹ کے اراکین کے لیے راہداری الاؤنس/ وظیفہ تھا۔ کئی سال کی جدوجہد کے بعد ۱۹۴۸ء میں پچاس لاکھ دستخطوں کے بعد یہ محضر نامہ پارلیمنٹ میں پیش کیا گیا جو اس وقت مسترد کر دیا گیا مگر طویل خونی جدوجہد کے بعد یہ مطالبات تسلیم کر لیے گئے اس محضری تحریک نے پورے یورپ کو متاثر کیا۔ ۱۹۴۷ء۔ ۱۹۴۸ء میں کمیونسٹ لیگ کا قیام اور کمیونسٹ مینی فیسٹو لکھا گیا۔ انگلستان میں ۱۸۵۰ء میں دس گھنٹے روزانہ کام کا قانون منظور ہوا اور یہ مزدور تحریک فرانس، جرمنی، آسٹریا، اٹلی، ہنگری، بلجیم، پرتگال، مشرقی یورپ، روس اور ریاست متحدہ ہائے امریکہ اور لاطینی امریکہ تک پھیل گئی۔ یکم مئی ۱۸۸۶ء کو امریکہ کے تمام بڑے شہروں پٹس برگ، پینی سلوینیا، بالٹی مور، واشنگٹن، سینٹ لوئی، نیویارک سمیت شکاگو میں لاکھوں مزدوروں نے ہڑتال کی یہ مزدوروں کی محض اوقات کار کے لیے نہیں بلکہ سیاسی تحریک تھی جو بین الاقوامی تحریک کا تسلسل تھا گو کہ خونی معرکوں کے بعد آٹھ گھنٹے کے اوقات کار کا قانون منظور ہوا

(باقی صفحہ ۲ پر)

بقیہ اداریہ

لیکن اگر آپ ۱۸۸۶ء سے ۲۰۲۶ء کے ۱۴۰ سالوں کا مختصر تجزیہ کریں تو اس میں سرمایہ دارانہ نظام کے اندر اور اس کے خلاف کئی انقلابات برپا ہوئے سوویت یونین، چین، کیوبا، شمالی کوریا، ویت نام وغیرہ میں سوشلسٹ انقلاب، ایشیاء، افریکہ، لاطینی امریکہ میں قومی آزادی و سماجی تبدیلی کی تحریکیں، پہلی و دوسری جنگ عظیم، سوویت یونین کا انہدام، دنیا یک قطبی سے کثیر القطبی، سرمایہ دارانہ نظام میں زوال پذیری و سامراجی ملکوں کی مسلط کردہ علاقائی جنگیں اور مسلح طاقت کے زور پر سامراج مخالف حکومتوں کے خاتمے جن میں عراق، لیبیا، شام، وینزویلا وغیرہ شامل تھیں، فلسطین میں نسل کشی اور ایران کے خلاف امریکی و اسرائیلی جنگ، خاص کر تیل کی دولت پر قبضے، اس جدید نو آبادیاتی نظام نے ترقی پذیر ملکوں میں استحصالی کی کئی شکلیں پیدا کردی ہیں۔ تیز تر ٹیکنالوجی کی ترقی نے سرمایہ دارانہ نظام میں بے روزگاری میں اضافہ کیا ہے سامراجی مالیاتی و تجارتی اداروں جن میں ورلڈ بینک، آئی ایم ایف، ڈبلیو ٹی او وغیرہ کی پالیسیوں نے نجکاری اور ٹھیکیداری نظام رائج کر کے مزدور طبقے کے استحصال میں کئی گنا اضافہ کیا ہے آج ہمارے ملک میں مزدور ۱۲ سے ۱۶ گھنٹے تک کام کرنے پر مجبور ہیں مزدور قوانین زیادہ جابرانہ اور استحصالی ہیں لیکن اس ساری صورت حال میں ہم شعوری طور پر سمجھتے ہیں کہ محنت کش طبقے کی نجات اور کم از کم اس کے بنیادی زندگی کے حقوق یعنی تعلیم، صحت، روزگار، رہنے کی چھت کے حق کا حصول اس جاگیر دارانہ و قبائلی باقیات اور سرمایہ دارانہ نظام کے خاتمے سے ہے، جو محنت کار عوام کی ایک انتہائی منظم اور بڑی سیاسی تحریک سے ہی ممکن ہوگا نیز کم از کم آٹھ گھنٹے کے اوقات کار کے عملی طور پر حصول اور مزدور دوست قانون سازی کے لیے بھی محنت کشوں کو ایک منظم تحریک اور طویل جدوجہد کی ضرورت ہے جس کے لیے محنت کشوں اور ان کی تنظیموں میں وسیع تر اتحاد کی ضرورت ہے اور اس عزم سے ہی ہم شکاگو کے جیالوں کو خراج تحسین پیش کر سکتے ہیں۔

ضروری گزارش

عوامی ورکرز پارٹی کے تمام ضلعی و صوبائی ذمے داروں سے درخواست ہے کہ وہ ہمیں اپنے اپنے علاقوں میں پارٹی سرگرمیوں کے بارے میں مطلع کریں تا کہ ہم اس پرچے کے ذریعے آپ کی سرگرمیوں سے ملک کے دیگر سیاسی کارکنوں کو باخبر رکھ سکیں۔ اس سلسلے میں پرچے میں درج ہمارے ای میل ایڈریس سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔

مزید برآں گزارش ہے کہ پرچے کے مالی اخراجات کو پورا کرنے میں ہماری مدد کیجیے اور پرچے کے واجبات جلد از جلد ادا کر کے شکریہ کا موقع دیجیے

ش (ادارہ)

مٹ جاؤ گے اک دن تم بھی

دہشت گرد بنانے والے
بدامنی پھیلانے والے
خیر کے دشمن شر کے حامی
تم پر لعنت ہم پر لعنت

تم تو ہو شیطان کے چیلے
کیسے کیسے کر کے حیلے
تم نے میری اس دھرتی پر
موسم کر دیئے سب زہریلے
تم پر لعنت ہم پر لعنت

بچوں پر تم بم برساؤ
اسکولوں کو آگ لگادو
موت مسلط کرنے والو
موت اپنی تم خود مرجاؤ
تم پر لعنت ہم پر لعنت

حد سے بڑھتے ظلم پہ بپھری
دھرتی نے گر کروٹ لے لی
عبرت کی تصویر بنے گی
مٹ جاؤ گے اک دن تم بھی
تم پر لعنت ہم پر لعنت

فطرت سے ٹکرانے والو
دنیا نرک بنانے والو
ظالم سے نفرت لازم ہے
ظالم پہ لعنت واجب ہے
تم پر لعنت ہم پر لعنت

ڈاکٹر فاطمہ حسن

ریاستی اسلام اور پاکستانی سیاست میں مذہب کا استعمال

پروفیسر امیر حمزہ ورک

پاکستان ایک مسلم ریاست کے طور پر بنایا گیا تھا اور اس لیے اس کے سیاسی ارتقاء میں مذہب کا ایک خاص کردار ہے۔ اس کردار کو دو مراحل میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، یعنی تقسیم سے پہلے اور بعد از تقسیم کے ادوار۔ تقسیم سے پہلے کے دور میں اسلام کو ایک مسلم ریاست کے حصول کے لیے سیاسی تحریک کے ایک موثر ہتھیار کے طور پر استعمال کیا گیا۔ تاہم، ایک بار جب قومیت کا سیاسی مقصد پورا ہو گیا تو پھر مذہب کے کردار پر قیادت کے زور میں واضح کمی واقع ہوئی۔ نتیجے کے طور پر، نظریات کا تنازعہ پیدا ہوا کیونکہ قیادت ایک سیکولر ریاست کی خواہش رکھتی تھی جب کہ وہ مذہبی سیاسی عناصر، جماعتیں اور بنیاد پرست جنھوں نے پاکستان کے قیام کی مخالفت کی تھی جو یہ سمجھتے تھے کہ پاکستان کا قیام آرتھوڈوکس اسلامی سوچ سے متصادم تھا۔ قیام پاکستان کے بعد ان گروہوں نے جنھیں احساسِ اجنبیت کا سامنا تھا، ریاستی قیادت اور خاص کر قائداعظم محمد علی جناح کی سوچ کے برعکس ایک کٹھ ملائیت قسم کی اسلامی ریاست کے قیام کے لیے شدت سے کوششیں شروع کر دیں۔

پاکستان کا قیام دو قومی نظریہ کی بنیاد پر ہوا تھا لیکن قیام پاکستان کے بعد یہ نعرہ اپنی معنویت کھو چکا تھا پھر 11 اگست 1947 کو اپنی مطابقت بھی کھو بیٹھا تھا، جب قائداعظم محمد علی جناح نے ایک عوامی بیان دیا تھا کہ مذہب فرد کا ذاتی معاملہ ہے اور مذاہب کی مساوات کو اجاگر کیا تھا۔ احمدیہ مخالف فسادات، قرارداد مقاصد، بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی رپورٹ، 1956 اور 1962 کے آئین نے پاکستان کے سیاسی ارتقاء میں مذہب کے کردار کو خاص مقاصد کے لئے ہی اجاگر کیا۔

پاکستان کے بانیوں نے "دو قومی نظریہ" کی بنیاد پر جنوبی ایشیائی مسلمانوں کے لیے ایک وطن کے طور پر سیاسی نظریہ پیش کیا۔ ہندوستانی مسلم عوام کو قومیت کی جدوجہد میں متحرک کرنے کے لیے ابتدا میں ایسا کرنا ان کے لیے موزوں تھا۔ لیکن دلچسپ امر یہ ہے کہ اس کے باوجود آرتھوڈوکس مسلم عناصر اور مذہبی جماعتوں نے مسلم لیگ یا جناح کے الگ ریاست کے خیال کی مخالفت کی کیونکہ ان کا ماننا تھا کہ مذہب قومیت کی بنیاد نہیں ہے اور صرف مشترکہ علاقہ ہی قوم کی تعریف کرتا ہے۔ جبکہ مغربی تعلیم یافتہ مسلم اشرافیہ نے کہا کہ ان کا مشترکہ مذہب اسلام ایک قوم بنانے کے لیے کافی ہے۔

پاکستان میں اسلام نے ہمیشہ زندگی کے مختلف شعبوں کو متاثر کیا ہے- معاشرہ، ثقافت، معیشت، قانون اور سیاست۔ مثال کے طور پر، ملکیت کے قوانین، غیر مسلموں کی حیثیت، سماجی ضابطہ اخلاق کی پابندی، سود سے پاک بینکنگ، سزا کی صورتیں، وراثت اور طلاق سے متعلق قوانین اور ریاستی معاملات میں علماء سو کا کردار اس نکتے کو واضح کرتا ہے۔ اس تصادم کی مثالیں پاکستان کی سیاست میں ہر دور میں ملتی ہیں- اس کے باوجود کہ پاکستانی اشرافیہ سیکولر خیالات رکھتی تھی -لیکن مذہبی جماعتوں اور امریکی سامراج کے دباؤ نے پاکستان کو ایک بنیاد پرست ریاست کے قیام میں بنیادی کردار ادا کیا- 1962 کے آئین میں ریاست کا نام عوامی جمہوریہ پاکستان تھا جو ایک سال بعد اسلامی جمہوریہ پاکستان کرنا پڑا- کیونکہ ہندوستان و ہندو دشمنی، سوشلزم اور سوشلسٹ قوتوں کا راستہ روکنے کی نوآبادیاتی پالیسی اور امریکی سامراج کی اپنی حکمت عملی اور مذہبی سیاسی جماعتوں کی سیاست چمکانے کے لئے مذہب کا استعمال کیا گیا جو کہ ایک گھٹیا عمل ہے اور مذہب جیسے مقدس آدرش کے ساتھ زیادتی ہے-

منزل انھیں ملی جو شریک سفر نہ تھے

مسلم اشرافیہ کی نمائندہ مسلم لیگ کے علاوہ کانگریس اور دوسری عالمی جنگ کے بعد تخلیق پانے والے نیو ورلڈ آرڈر جس کی باگ ڈور امریکی سامراج کے ہاتھ میں تھی پاکستان بنانے کی حامی قوتوں میں شامل تھے- کانگریس اور مسلم لیگ دونوں امریکی سامراج کے ماتحت اس نئے عالمی نظام کو سپورٹ کر رہی تھیں تبھی تو ہندوستان کو اکھٹا رکھنے کے پروگرام و برطانوی پلان، کیبنٹ مشن پلان کو کانگریس نے ناکام بنایا تھا- لیکن تمام مسلم مذہبی جماعتیں (جماعت اسلامی، مجلس احرار، جمعیت علمائے ہند وغیرہ) پاکستان کی مخالفت کر رہی تھیں- پاکستان بننے کے بعد ہندو مسلم تنازعہ تو ختم ہو گیا جو ہندوستان دشمنی میں تبدیل ہو گیا لیکن نوآبادیاتی پالیسی کے تحت جو مذہبی کارڈ یا سیاست میں مذہب کا استعمال ہندو مسلم اختلاف کی بنیاد پر کھیلا جاتا تھا اس کا آغاز احمدیہ مخالف تحریک سے ہوا-

ممتاز سکالر بی ایم چنگاپا لکھتے ہیں کہ "پاکستان کا پہلا اہم تنازعہ جس میں

مذہب اور سیاست دونوں شامل ہیں "احمدیہ (جسے قادیانی بھی کہا جاتا ہے) فرقے سے متعلق ہے" جو پہلی بار 1950 کی دہائی کے اوائل میں اور اس کے بعد 1970 کی دہائی کے وسط میں سامنے آیا -احمدیہ مسئلہ ابتدائی سالوں میں پاکستان کے قومی انضمام میں ایک سنگین مسئلہ ثابت ہوا۔ اس مسئلے کی ابتدا تقسیم سے پہلے تھی جب احرار دیوبندی فرقے نے 1920 کی دہائی میں احمدیوں کے خلاف پہلی تحریک شروع کی۔ احرار اس وقت کانگریس کے ساتھ اتحاد کر رہے تھے اور ' ناں پاکستان' کے نام سے ایک جوابی تحریک میں مسلم لیگ کی مخالفت کر رہے تھے۔ احرار کے یہ رہنما اس حد تک راسخ العقیدہ تھے کہ انہوں نے قائداعظم کو کافر اعظم تک کہہ دیا۔

انہوں نے ایک علیحدہ اور آزاد مسلم ریاست کی جدوجہد کے ابتدائی مرحلے میں پاکستان مخالف تحریک کا حصہ بنایا۔ اس کے بعد 1931 میں احرار کانگریس سے الگ ہو گئے اور اپنی مذہبی جماعت مجلس احرار اسلام بنائی۔ احرار قائدین نے احمدیہ فرقہ کی مخالفت کے لیے اپنے پیروکاروں کے چھوٹے گروہ قادیان بھیجے اور انہیں غیر اسلامی جماعت قرار دیا۔ نتیجے کے طور پر، سابقہ برطانوی ہندوستانی حکومت نے صوبے میں امن وامان کی خرابی کے امکانات کو بھانپ لیا اور فوری طور پر مجلس احرار اسلام پر پابندی لگا دی۔ بالآخر پاکستان کی حقیقت کے ساتھ انہوں نے مسلم لیگ کے ساتھ اتحاد کر لیا۔

احراروں نے ایک فرقہ کے طور پر پاکستان میں زندگی کا آغاز ایک داغدار سیاسی امیج کے ساتھ کیا کیونکہ انہوں نے ابتدائی طور پر تقسیم ہند سے قبل ایک الگ مذہبی ریاست کے قیام کی تحریک کی مخالفت کی تھی۔ اس پس منظر کو دیکھتے ہوئے احرار، جنہوں نے پاکستان بنانے کی مخالفت کی، نے یہ ضروری سمجھا کہ وہ نئی مسلم ریاست میں اپنے اصولوں کو قائم کریں۔ اس طرح انہوں نے احمدیہ فرقہ کے خلاف پوشیدہ دشمنی کو ہوا دینے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی۔ احراروں نے پاکستان میں قومی دھارے میں قبولیت حاصل کرنے کے لیے احمدیوں کے لیے عسکری پالیسی اختیار کی۔ احمدیوں کے خلاف ان کے اقدام کا مولانا مودودی اور جماعت اسلامی (جے آئی) نچن کا احرار کے ساتھ اشتراک تھا، نے خوش آمدید کہا۔ جماعت اسلامی نے بھی برٹش انڈیا کی تقسیم اور پاکستان کے قیام کی بھی مخالفت کی۔ اس لیے جماعت اسلامی اپنے اس ملک دشمن امیج کو ختم کرنے کے لیے کوشاں تھی۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے ایک ایسی اسلامی ریاست کی ضرورت کی وکالت کی جو اللہ کی حاکمیت پر یقین رکھتی ہو اور قرآن پاک کے احکام کے مطابق ہو۔ کیونکہ انھیں اس بات کا علم تھا کہ مذہب ہر انسان کا ایک نازک مسئلہ ہے اصل لئے اس نئی ریاست میں اپنی حب الوطنی ثابت کرنے کے لئے انھوں نے مذہبی کارڈ کھیلنے کا فیصلہ کیا-

اس طرح احرار اور جماعت اسلامی نے پاکستان کو اسلامی ریاست بنانے کی جدوجہد میں ہاتھ ملایا۔ ان دو پاکباز اسلامی گروہوں نے وزیراعظم لیاقت علی خان اور ان کی مسلم لیگی حکومت پر اسلامی حکومت کو یقینی بنانے کے لیے دباؤ ڈالنا شروع کیا۔ یہ راسخ العقیدہ مسلم عناصر اس حد تک کامیاب ہوئے کہ حکومت نے پاکستان میں نظریہ اسلام کو مضبوط کرنے کے لیے 1949 میں 'قرارداد مقاصد' پاس کی-

قرارداد مقاصد پاکستان کی آئینی تاریخ کا پہلا سنگ میل تھا۔ یہ اسلامی ریاست کی تعریف کرنے کی پہلی کوشش تھی اور اس لیے ملک میں بنیاد پرست علماء کی فتح کی علامت تھی۔ دستور ساز اسمبلی نے 12 مارچ 1949 کو قرارداد مقاصد کو منظور کیا اور اس کی اہمیت بڑھ گئی کیونکہ اس نے اشارہ کیا کہ حکومت نے اصولی طور پر اسلامی ریاست کے حتمی مقصد کو قبول کر لیا ہے۔ جماعت اسلامی کے رہنما ابوالاعلیٰ مودودی سب سے اولین نظریہ ساز ثابت ہوئے جنہوں نے خود کو اسلامی ریاست کے تصوراتی ڈھانچے پر لاگو کیا۔

بنیادی اصول کمیٹی کی رپورٹ

جب قرداد مقاصد لکھی جا رہی تھی تو اس وقت ترقی پسند حلقوں کی طرف سے دو سوال اٹھائے گئے تھے-

1- قائداعظم محمد علی جناح کی زندگی میں قرارداد مقاصد کیوں نہ پیش کی گئی؟

2- قرارداد مقاصد لکھنے کے بعد اس کی نوک پلک سنوارنے کے لئے اسے جیل میں مولانا مودودی کے پاس کیوں بھیجا گیا؟

ان سوالوں کے جواب کی بجائے ترقی پسند اور سوشلسٹ قوتوں کے خلاف حکومتی عناصر اور مذہبی جماعتوں کی طرف سے پراپیگنڈہ کیا گیا-

لیاقت حکومت نے ریاست پاکستان کا نیا آئین بنانے کے لئے بنیادی اصولوں کی کمیٹی (پی بی سی) بنائی گئی جس نے قرارداد مقاصد کی روشنی میں نئے آئین کے اصول مرتب کرنے تھے- بی بی سی کی رپورٹ درحقیقت تین رپورٹس پر مشتمل ہے جو دو سال کے وقفوں سے شائع کی گئیں۔ پہلی، 1950 کی عبوری رپورٹ اور دوسری 1952" کی باقاعدہ رپورٹ کو دستور ساز اسمبلی نے قبول نہیں کیا، یہ رپورٹس سیاسی اور مذہبی مسائل سے متعلق مسائل کی وجہ سے قبول نہیں کی گئیں

پی بی سی کی رپورٹ نے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935 کی طرز پر بنائے گئے پارلیمانی نظام کی وکالت کی۔ تاہم، بنیاد پرست دھڑوں کے مفادات

کو مدنظر رکھنا ضروری تھا۔ اس مقصد کے لیے اس نے پانچ اراکین پر مشتمل علمائے کرام کے بورڈ کے لیے یہ مشورہ دیا کہ آیا مقنّنہ کے سامنے پیش کیا گیا کوئی بل اسلامی اصولوں کے خلاف ہے یا نہیں۔ ایسی صورت میں جب بورڈ کسی متفقہ فیصلے پر پہنچنے سے قاصر تھا، ریاست کے سربراہ کو ایک بل پر دستخط کرنے کے لیے اپنی صوابدید استعمال کرنی تھی۔ تاہم علماء بورڈ کے مشاورتی کردار سے ناخوش تھے اور اس کے بجائے انہوں نے ایک بل کی اسلامی نوعیت پر غور کرنے کے لیے اپنے لیے سپریم کورٹ کا مطالبہ کیا۔ ایک لحاظ سے وہ چاہتے تھے کہ ان کی طاقت سفارش سے بڑھ کر نفاذ کی طاقت تک پھیل جائے۔ جبکہ جدیدیت پسندوں نے محسوس کیا کہ علماء کو پہلے ہی کافی اہمیت دی گئی تھی اور وہ تھیوکریسی کی شکل اختیار کرنے سے محتاط رہے۔

پی بی سی کی رپورٹ 1954 میں اسمبلی نے منظور کی۔ بی پی سی کی رپورٹ کی اہمیت اس حقیقت میں ہے کہ یہ بنیاد پرستوں کے اس مطالبے کو رد کرنے میں کامیاب رہی کہ پارلیمنٹ کو نہیں بلکہ شریعت کو خود مختار ادارے کا درجہ دیا جانا چاہیے۔ جبکہ علماء کا کردار مشاورتی تھا، یہ سیاستدانوں کے لیے مخصوص مسائل پر اپنے خیالات کو مسترد کرنا مشکل ثابت ہوگا۔ اس لیے بی پی سی کی رپورٹ نے قرون وسطی کی تھیوکریسی کے ساتھ مل کر پارلیمانی جمہوریت بنانے کی تجویز پیش کی۔ پی بی سی کی رپورٹ میں اقلیتوں کے لیے علیحدہ انتخابی حلقوں اور نشستوں کے ریزرویشن کی سفارش کی گئی ہے۔ ہندو اور مشرقی پاکستان کے ارکان نے ان سفارشات کی شدید مخالفت کی۔" مسٹر دتا نے کہا کہ رپورٹ کو ختم کر دینا چاہیے اور ایک بار پھر سے نئی مشق شروع کرنی چاہیے۔ پروفیسر آر کے چکرورتی نے کہا کہ رپورٹ ایک دھوکہ ہے جس نے صرف جناح کو دھوکہ دیا۔"

قرارداد مقاصد اور پی بی سی کی رپورٹ کی روشنی میں 1956 کا آئین بنایا گیا جس میں مشرقی اور مغربی پاکستان کے مابین آبادی کے تناسب اور جمہوری اصولوں اور 1935 کے ایکٹ کو نظر انداز کرتے ہوئے برابر نمائندگی یا پیرٹی کا فارمولا پیش کیا اور دو ایوانی مقنّنہ کی بجائے یک ایوانی مقنّنہ کو آئین کا حصہ بنا ڈالا۔

ایوب خان کے دور میں اسلام کا استعمال

قائداعظم نے تو واضح طور پر اس اصول کو دہرایا تھا کہ مذہب ہر انسان کا ذاتی فعل ہے اس کا ریاست اور ریاستی پالیسیوں سے کوئی تعلق نہیں ہوگا لیکن پاکستان کی ہر حکومت نے مذہب کو ایک ہتھیار کے طور پر اپنے اقتدار کے لئے استعمال کیا۔ گو اس میں پاکستان کا ایک جدید نوآبادیاتی نظام کے تحت امریکی سامراج کی مذہب کو سوشلزم کے خلاف استعمال کرنے کی پالیسی کو بھی دخل حاصل رہا ہے۔ پاکستان کا دوسرا آئین یکم مارچ 1962 کو نافذ کیا گیا اور فیلڈ مارشل ایوب خان کو دیے گئے مینڈیٹ کو استعمال کرتے ہوئے نافذ کیا گیا۔ آئین نے ابتدائی طور پر پاکستان کو ایک جمہوریہ قرار دیا تھا اور "اسلامی" اصطلاح کو ختم کر دیا گیا تھا، لیکن 1963 میں پہلی آئینی ترمیم میں مذہبی جماعتوں اور بنیاد پرست عناصر کے احتجاج کے بعد اس نے پاکستان کو دوبارہ اسلامی جمہوریہ کا نام دیا تھا۔ نیز تمام قوانین کے اسلام کے مطابق لائے جانے کی شق بھی نئے آئین میں باقی رہی اور کوئی نیا قانون جو اسلام سے متصادم نہ ہو۔ پاکستان میں صدارتی نظام حکومت ہونا تھا کیونکہ یہ ایک مضبوط ایگزیکٹو کی اسلامی روایت کے مطابق تھا۔

1962 کے آئین میں اسلامی کردار پر زور دیا گیا اور اسلامی نظریات کی ایک مشاورتی کونسل کا انتظام کیا گیا جو صدر کی طرف سے تین سال کے لیے مقرر کردہ 5-12 اراکین پر مشتمل ہونا تھا۔ کونسل پاکستان کے مسلمانوں کو ہر لحاظ سے اپنی زندگیوں کو اسلام کے اصولوں اور تصورات کے مطابق ترتیب دینے کے قابل بنانے اور ان کی حوصلہ افزائی کرنے کے ذرائع کے بارے میں حکومت کو سفارشات پیش کرنا تھی۔ حکومتی اداروں کو قوانین سے متعلق مسائل پر مشورہ دینا۔ تاہم، اس کا مشورہ حکومت پر پابند نہیں تھا۔ آئین نے حکومت کو اسلامی امور کے لیے ایک تحقیقی ادارہ قائم کرنے کی ہدایت بھی کی تاکہ مسلم معاشرے کی صحیح معنوں میں اسلامی بنیادوں پر تشکیل ہو۔ پاکستان ایک اسلامی جمہوریہ ہونے کے ناطے جس میں اسلام کا غلبہ ہوگا وہ غیر مسلم اقلیتوں کے حقوق پر قدغن لگانے کا پابند ہوگا۔ تاہم، آئین کے ان مذہبی پہلوؤں کو متوازن کرنے کے لیے، بنیادی حقوق، علاقائی اور شہریت کے حقوق جدید اور سیکولر کردار کے حامل تھے۔

ایوب دور حکومت میں مذہب اور سیاست کے درمیان تصادم کی دوسری خاص بات فاطمہ جناح کیس سے متعلق ہے۔ جنوری 1965 کے صدارتی انتخابی مہم میں کمبائنڈ اپوزیشن انتخابات میں متحدہ اپوزیشن نے مس فاطمہ جناح کو صدر ایوب خان کے مقابلے میں امیدوار کے طور پر کھڑا کیا۔

ان کا فیصلہ ایک سیاسی فیصلہ تھا اور اس کے بعد مذہبی عقلیت کے ساتھ اس کی پیروی کی گئی۔ یہ تنازعہ اس لیے پیدا ہوا کیونکہ آرتھوڈوکس اسلام واضح طور پر کہتا ہے کہ عورت کو سربراہ مملکت کے لیے ووٹ نہیں دیا جا سکتا۔ پھر بھی جماعت اسلامی جیسی مذہبی سیاسی جماعتوں نے مس جناح کی امیدواری کی بھرپور حمایت کی۔ ان کا دعویٰ صرف یہ تھا کہ جب کہ ایسا اقدام مذہب کے مطابق نہیں ہے تو یہ شریعت کے مطابق ظالمانہ آمریت کو دوام بخشنا بہت بڑا گناہ ہے۔ اس حد تک 1965 کے انتخابات اسلام اور غیر اسلامی قوتوں کے درمیان تصادم کے بجائے

جمہوریت اور آمریت کے درمیان معرکہ آرائی ثابت ہوئے۔

ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت

سانحہ مشرقی پاکستان کے بعد دو قومی نظریہ کی تھیوری کو زبردست دھچکا پہنچا۔ پاکستان کے مشرقی بازو کے نقصان نے راسخ العقیدہ عناصر کو اپنی کوششوں کی تجدید اور اس بات کو یقینی بنانے کی تحریک دی کہ پاکستان کی نظریاتی بنیاد محفوظ ہے۔ مزید یہ کہ زیڈ اے بھٹو نے اسلامی سوشلزم کا آغاز کیا جس پر راسخ العقیدہ گروہوں کی طرف سے شدید تنقید ہوئی۔ ان راسخ العقیدہ مولویوں یا بنیاد پرستوں کو خوش کرنے کے لیے بھٹو نے 1973 کے آئین میں اسلام کو 'ریاستی مذہب' قرار دیا اور واضح طور پر کہا کہ 'صرف ایک مسلمان ہی پاکستان کا صدر بننے کا حقدار ہے'۔ آئین میں اسلامی دفعات کو شامل کرنے کے اپنے مقصد میں علماء کے کامیاب ہونے کے بعد ان کا اگلا اقدام احمدیہ مخالف مہم کو دوبارہ شروع کرنا تھا۔ مولانا مودودی نے احرار رہنما آغا شورش کشمیری کے ساتھ مل کر احمدیہ مخالف تحریک کی قیادت کی اور انہوں نے مل کر بھٹو پر احمدیوں کے ساتھ ہمدردی پیدا کرنے کا الزام لگایا۔ مزید انہوں نے احمدیوں کے خلاف آئینی اور قانونی اقدامات کا مطالبہ کیا۔ 1973 میں پاکستان مقبوضہ کشمیر کے صدر سردار قیوم خان نے احمدیوں کو غیر مسلم قرار دینے کے لیے صوبائی اسمبلی میں قانون سازی کی۔ اگلے سال لاہور میں او آئی سی کی کانفرنس منعقد ہوئی اور سعودی، لیبیا اور اردن کے نمائندوں نے احمدیوں کے خلاف ایک پریشر گروپ کے طور پر کام کیا۔ بعد ازاں اپریل 1974 میں جدہ میں ایک میٹنگ میں احمدیوں کو 'غیر مسلم اقلیت' قرار دیا گیا اور وہاں موجود پاکستانی وفد نے اس پر اتفاق کیا۔

ضیاء حکومت: ریاست کی سرپرستی میں اسلام

ضیاء حکومت کا تعلق ریاستی سرپرستی میں چلنے والے اسلام سے ہے جس کی وجہ سے صرف سیاسی اسلام کی بحالی ہوئی۔ انہوں نے اسلامی جمہوریت یا اسلامی جمہوریت کے قیام کی ضرورت پر روشنی ڈالی جو نظام مصطفیٰ یا حکم رسول کے تصور سے مماثل ہو۔ جنرل ضیاء الحق نے کہا کہ حکومت کی غیر ملکی شکلیں اسلامی اخلاقیات کے مخالف ہوں گی۔ اس حد تک، پاکستان جیسا غریب ملک ان کے خیال میں مغربی طرز کی جمہوریت کے عیش و عشرت کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ ان اسلامی اقدامات کا نتیجہ یہ نکلا کہ بنیاد پرست مولویوں یا علماء کو اہمیت حاصل ہوئی اور ملک میں فرقہ وارانہ تفرقہ پر زور دیا گیا۔

ضیاء نے جولائی 1977 سے اگست 1988 تک اپنی غیر آئینی فوجی حکومت کو قانونی حیثیت دینے کے لیے اسلام کو ایک آلے کے طور پر استعمال کیا۔

ضیاء نے 1977 میں بغاوت کے بعد اقتدار سنبھالنے کے بعد اعلان کیا کہ وہ ملک کی سیاست، معاشرے اور معیشت کو قرآن و سنت کے مطابق بہتر بنائیں گے۔

مارشل لاء کے عبوری دور میں امن و امان کی صورتحال کو بہتر بنانے کے لیے کچھ قانونی اقدامات پر عمل درآمد کرنا ان کے لیے موزوں تھا۔ یہ اقدامات دراصل وہ وحشیانہ سزائیں تھے جن کی حمایت اسلامی قانون کرتا ہے اور صرف ضیاء کے لیے سول سوسائٹی پر اپنی گرفت مضبوط کرنے کے لیے مفید ثابت ہوئے تاکہ اختلاف رائے کو دبایا جا سکے۔ ضیاء نے اسلام کا مذاق اڑایا اور کہا کہ خدا نے انہیں پاکستان کا حکمران مقرر کیا ہے۔ اسلامی سیاسی نظام میں حاکمیت اللہ تعالیٰ کی ہے اور یہ کہ لوگ صرف تفویض اختیارات استعمال کرتے ہیں۔ اور اسلام اپنے پیروکاروں کو اپنے نمائندوں کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی ہدایت کرتا ہے۔ ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت کی طرف سے احمدیوں کو غیر مسلم اقلیتی فرقہ قرار دینے کے بعد سیاست میں مذہب کا مسئلہ پس پردہ رہا۔ ضیاء حکومت نے بنیاد پرست جماعت اسلامی کے ساتھ قریبی تعلقات استوار کیے جو پاکستان بننے کی مخالف ہونے کے باوجود اسلامی ریاست کی تحریک میں سب سے آگے تھی۔ مارچ 1984 میں چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل ضیاء نے '11' نکاتی اسلامی چارٹر' کا تصور پیش کیا جس میں ملک میں اسلامی سیاسی نظام کے لیے بنیادی تقاضے شامل ہیں۔ ان میں شامل ہیں۔

عام انتخابات اسلامی شریعت پر مبنی ہوں گے اور مارچ 1985 میں منعقد ہوں گے۔ بادشاہت اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں تھی۔ سربراہ مملکت اپنے منتخب نمائندوں اور انتظامیہ کے ساتھ اسلامی اصولوں کے مطابق اللہ تعالیٰ کی مرضی پر عمل پیرا ہوں گے۔ اسلام ریاستی ڈھانچے کے لیے رہنما اصول فراہم کرتا ہے کیونکہ اس میں ایمان، معیشت اور سیاست شامل ہے۔

ضیاء کے بعد کے ادوار میں سیاست میں مذہب کا استعمال

ضیاء الحق کے بعد بھی پاکستان کی مختلف حکومتوں نے کسی نہ کسی حد تک مذہب کو سیاست میں استعمال کیا، مگر طریقہ، شدت اور مقصد وقت کے ساتھ بدلتے رہے ہیں۔ یہ ایک سیدھی لائن نہیں بلکہ مختلف ادوار میں مختلف شکلیں اختیار کرتا رہا ہے۔

ضیاء کے بعد (1988 ۔ 1999) بینظیر بھٹو اور نواز شریف کے ادوار میں ضیاء کے بنائے ہوئے کئی مذہبی قوانین (مثلاً حدود آرڈیننس) برقرار رہے۔ مذہبی جماعتوں کو مکمل طور پر الگ نہیں کیا گیا بلکہ سیاسی ضرورت کے مطابق

ان سے مفاہمت کی گئی-نواز شریف کے دوسرے دور میں شریعت بل (15ویں ترمیم) جیسی کوششیں ہوئیں، جس سے مذہب کو ریاستی ڈھانچے میں مزید مرکزی بنانے کی کوشش نظر آتی ہے۔ پرویز مشرف کے دور میں 1999 سے 2008 مذہب کو بظاہر کچھ حد تک سیاست سے پیچھے رکھنے کی کوشش کی گئی اور امریکیوں کی ضرورت کے مطابق کبھی بنیاد پرست مذہبی جرنیل تو کبھی لبرل جرنیل کے مصداق مشرف نے روشن خیال اور اعتدال پسند ہونے کا ڈرامہ رچایا لیکن عملی طور پر افغان جنگ کے تناظر میں دوہری اور منافقت پر مبنی پالیسی اپنائی گئی جسے گڈ طالبان اور بیڈ طالبان بھی کہا جاتا ہے اور اسی جنگ کے تناظر میں مذہبی جماعتوں کے اتحاد ایم ایم اے کو خیبر پختونخواہ کی حکومت پلیٹ میں رکھ کر دی گئی-

آصف علی زرداری اور پھر دوبارہ نواز شریف کے ادوار میں عمومی طور پر نسبتاً لبرل بیانیہ رکھنے کی کوشش کی گئی، لیکن توہینِ رسالت قوانین جیسے حساس مذہبی معاملات کو چھیڑنے سے گریز کیا گیا۔ ممتاز قادری کا کیس اور اس کے بعد عوامی ردعمل نے دکھایا کہ مذہب سیاست میں ایک طاقتور عنصر ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ عمران خان جس کی شہرت ایک لبرل اور کاؤبوائے کے طور پر تھی اس کے دور میں بھی مذہب اور مذہبی نعروں کو سیاسی مفادات کے لئے استعمال کیا گیا-اس نے ریاست مدینہ کے تصور کو استعمال کیا اور یہ مذہبی حوالہ دیکر ایک نام نہاد فلاحی ریاست کا خواب دکھایا-اس کے دور میں بھی ختمِ نبوت، ناموسِ رسالت اور اسلامی شناخت جیسے موضوعات کو سیاسی بیانیے میں نمایاں رکھا گیا۔ تحریک لبیک پاکستان جیسے گروہوں کے ساتھ ٹکراؤ اور پھر مذاکرات—یہ بھی مذہب اور سیاست کے پیچیدہ تعلق کی مثال ہے۔

شہباز شریف اور دیگر سیاسی قوتیں جو اس وقت برسر اقتدار ہیں-کھل کر مذہبی نعرہ بازی کم نظر آتی ہے، لیکن مذہبی حساس ایشوز (جیسے ختمِ نبوت، توہینِ رسالت) پر سخت موقف برقرار رکھا جاتا ہے۔ سیاسی مخالفت میں بھی بعض اوقات مذہبی حوالہ یا اخلاقی جواز پیش کیا جاتا ہے۔ الغرض ضیاء کے دور میں جس گھمبیر طریقے سے مذہب کو سیاست، سماجیات، تعلیمی نظام اور ہر شعبے میں شامل کی گیا وہ پالیسی جاری ہے اور اب بھی مذیب پاکستان کے ریاستی و قانونی ڈھانچے میں مضبوطی سے شامل ہے-ضیاء کے بعد آنے والی ہر حکومت نے اپنی سیاسی ضروریات کے لئے مذہبی سیاسی جماعتوں کے دباؤ اور مخصوص سیکورٹی حالات کا جواز پیش کر کے مذہب کو سیاسی مفادات کی بھینٹ چڑھاتی چلی آرہی ہیں-

ہمارے عوام، مذہب اور ترقی پسند سیاست

ہمارے عوام کی تھریک اور زندگی میں اسلام ایک تاریخی حقیقت ہے یہ عوام کی ایک ایسی تاریخی حقیقت ہے جو ذہن و روح سے تعلق رکھتی ہے-یہ عوام کا گہرا روحانی، جذباتی، ذہنی اور قلبی مسئلہ ہے- آپ اسے ایمانی مسئلہ بھی لے لیں-جب یہ عوام کا گہرا دینی، اور جذباتی مسئلہ ہے تو لازم ہے کہ اس میں تحقیق کریں-اس میں چھپی حقیقتیں تلاش کریں کیونکہ بائیں بازو اور ترقی پسند مفکروں پر یہ واضح کرنے کی ضرورت ہے کہ انھیں ہر مسلے میں تحقیق کی ضرورت ہے-لیکن ترقی پسند، بائیں بازو والے یا سوشلسٹوں نے یہ کام دائیں بازو والوں پر چھوڑ رکھا ہے-لیکن دائیں بازو والے جن میں 80 سال کی حکومتیں اور مذہبی و سیاسی جماعتیں بھی شامل ہیں وہ اس بات کے پابند نہیں کہ اور نہ ہی ان پر یہ کام چھوڑا جا سکتا ہے کہ وہ عوامی مسائل پر تحقیق کریں کیونکہ دائیں بازو والوں کی سوچ لبرلزم، یورپ کی تحریک احیائے علوم، اور یورپ کی سرمایہ دارانہ تہذیب سے آگے نہیں بڑھتی جس کا تانا بانا کارل مارکس نے ایک صدی قبل بکھیر کر رکھ دیا تھا- کارل مارکس نے سرمایہ دارانہ نظام اور، دائیں بازو کی جادوگری کی حقیقت کھول کر رکھ دی تھی- اس لئے دائیں بازو والے فرد، اجتماعیت، تحریک، نظرئے اور مذہب کے بارے میں کیوں تحقیق کریں گے-

دوسری طرف بائیں بازو والے ہیں جنھیں مارکسسٹ بھی کہا جاتا ہے- لیکن جب ہم اپنے ملک کے بائیں بازو کو دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ بائیں بازو کے مفکروں نے بھی تحقیق کا شیوہ ترک کر دیا ہے-چنانچہ اسلام کے بارے میں اور اس کی پاکستانی سماج میں پکڑ۔ گہرائی اور اس کے سیاسی استعمال ہونے والے نقصانات پر تحقیق کی ضرورت ہے-حکمرانوں، بادشاہوں، اہل اقتدار، اور علمائے سو نے مخصوص مفادات کے تحت مذہبی اقدار پر جھوٹ کے گرد و غبار کی تہہ جما دی ہے-غلام دارانہ سماج سے لیکر آج کے طبقاتی سماج کے دور تک اسلام کی سچائیوں کا کیا حلیہ رہا ہے اور اس نے انسانی سچائیوں کو کس طرح دیکھا ہے-اس پر بائیں بازو والوں نے ہرگز تحقیق و کاوش سے کام نہیں لیا-متحدہ ہندوستان سے لیکر آج تک اسلام کے بارے میں مارکسیوں کے جو تھیسز ملتے ہیں ان میں ایم این رائے، ڈبلیو سی سمتھ، اور رضا کاظم کے ہیں-اس کے علاوہ کچھ لکھا ہوا نہیں ملتا-لیکن اسے بھی مارکسسٹوں نے پڑھے بغیر ہی درخواعتنا نہیں جانا-اس لئے عوامی تحریک کو منظم کرنے کے لئے عوام کے اس تہذیبی و مذہبی وثقافتی پہلو کو از سر نو دیکھنے، پڑھنے اور تحقیق کی ضرورت ہے تا کہ عوام کو اسلام کے نام پر حکمرانوں، جاگیرداروں، سرمایہ داروں۔ عالمی سامراج اور علمائے سو کی بے وقوف بنانے اور اسلام کو ریاست یا اقتدار کے لئے استعمال کرنے کی ہر سازش کو ناکام بنایا جا سکے-

☆.....☆

پاکستان کی گرتی ہوئی معیشت

تحریر زاہد پرویز

پاکستان کی معیشت ایک گرتی ہوئی مکسڈ معیشت ہے اور جی ڈی پی کے حوالے سے دنیا کی بیتالیسویں معیشت ہے جس کا بڑا انحصار زراعت اور ٹیکسٹائل اور سروسز پر ہے اور اس حوالے سے ہمیشہ بلند ہوتی ہوئی انفلیشن اور Deficits Fisala کا سامنا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اس کی 25 کروڑ آبادی 2.7 فیصد مجموعی گھریلو پیداوار اور کل معیشت کا انحصار 23 فیصد زراعت پر ہے اور اس کے ساتھ ساتھ سروسز پر انحصار جو کہ کل جی ڈی پی کے 50 فیصد کے قریب ہے بشمول صنعت، ٹیکسٹائل اور کاٹن 2 ایسے سیکٹر ہیں جو ایکسپورٹ اور صنعتی حوالے سے پاکستان کی معیشت کی ریڑھ کی ہڈی کی مانند ہیں۔ پاکستان کی 25 کروڑ آبادی جس کا زیادہ حصہ لیبر فورس پیدا کرتا ہے اور یہی لیبر فورس ہماری مارکیٹ کو سہارا دیتی ہے جبکہ دوسری طرف ملک کے Resources اور انفراسٹرا کچر پر بوجھ بھی بنتی جا رہی ہے کیونکہ ان کی آمدنی بہت محدود ہوتی ہے اور اسی لئے اندرونی مارکیٹ کو دباؤ سے بچانے کے لئے بے نظیر انکم سپورٹ جیسے پروگرام بنائے جاتے ہیں اور اسی لیبر فورس کی Remitances جو کہ 2025 کے اعداد و شمار کے حوالے سے 38 بلین بنتی ہے اور اسی سے پاکستان اپنا خسارہ پورا کرنے کی کوشش کرتا ہے اور میکرو اکنامک کے حوالے سے ہمیں بڑھتی ہوئی انفلیشن کے ساتھ انرجی میں دن بہ دن کمی اور دوسرے ملکوں کے قرضہ جات کا دباؤ ہماری معیشت کو کھائے جا رہا ہے۔ ایک اور بڑا اہم مسئلہ جو انڈسٹری کے حوالے سے ہے کہ پاکستان کے صرف چند شہر جیسے کراچی، لاہور، سیالکوٹ، گوجرانوالہ، فیصل آباد میں جہاں انڈسٹری ہے باقی پورا ملک اس خوبی سے مبرا ہے۔ ہماری بیمار انڈسٹری کا یہ بھی ایک ایشو ہے کہ ملک کے بیشتر شہروں میں انڈسٹری نہ ہونے کے برابر ہے۔ تجارتی نقطہ نگاہ سے ہمارے پاس صرف چائنہ ایک ملک ہے جس کے ساتھ ایک بڑا اور مستقل تجارتی رشتہ موجود ہے اور وہ ہے ''چائنہ۔ پاکستان معاشی کوریڈور'' اس کے علاوہ ہماری تجارتی منڈی کہیں بھی مستقل نہیں ہے اور اس تجارتی اتار چڑھاؤ میں ہم اپنی معیشت کو ایکسپورٹ کے حوالے سے آگے نہیں بڑھا سکتے۔ ہماری معیشت کا ایک اور اہم ایشو ٹیکسز کے حوالے سے ہے۔ ہم کافی عرصہ سے ڈاکومنٹری اکنامی کو آگے نہیں بڑھا سکے جسکی وجہ سے ہم ٹیکسز کا ٹارگٹ ہمیشہ پورا نہیں کرتے اور اس کی میں ایف بی آر کی پوری مشینری ذمہ دار ہے۔ جس کا پاکستان پر قرضہ 6 ملین ڈالر ہے۔ بہرحال پاکستان کی پوری معیشت کا یہ ایک مختصر ڈھانچہ ہے اور اسی ڈھانچہ کو بنیاد بنا کہ ہم ہر سال ایک بجٹ پیش کرتے ہیں جس کا ابتدائیہ وزیر خزانہ ان الفاظ سے کرتے ہیں کہ حکومت کی ترجیح یہی ہے کہ ایسی معیشت کی تشکیل کی جائے کہ جو ہر طبقے کو ترقی کے ثمرات دے مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہمارا ملک ترقی کی راہ پر گامزن ہے اور کیا اس ملک کی آبادی جو مختلف طبقوں پر مشتمل ہے یعنی وہ طبقہ جو ذرائع پیداوار کا مالک ہے یا وہ جو ذرائع پیداوار کے مالک نہیں اور اپنی محنت بیچ کر اپنی زندگی کی گاڑی چلا رہے ہیں کیا ملک کی ترقیاتی سکیمیں ان لوگوں کے لئے بھی بنائی جاتی ہیں جو اس ملک کی آبادی کا 80 فیصد ہے اور جو ذرائع پیداوار کے مالک نہیں جواب صرف یہ ہے کہ پچھلے 79 سالوں میں اس ملک کی 80 فیصد آبادی کو مدنظر رکھ کر ترقیاتی اسکیمیں نہیں بنائی جاتیں اور اس کی سب سے بڑی وجہ اس ملک کی فنانشل فزیکل معاشی مجبوریاں ہیں اور پھر ہمارے بجٹ کا ایک بہت بڑا حصہ غیر پیداواری اخراجات جیسے قرضوں پر موجود سود کی ادائیگی، دفاعی بجٹ جو کہ ہماری فارن پالیسیوں کی وجہ سے کرنا پڑتا ہے اور ان دو بڑے اخراجات کے بعد ہمارے پاس کون سی بڑی رقم بچتی ہے جو کہ ہم اس ملک کی 80 فیصد آبادی کی بھلائی کے لیے خرچ کریں اس لئے اگر ہم ہر سال کے بجٹ کے اعداد و شمار پر نظر ڈالیں تو یہ بات عیاں ہے کہ وہ ہماری حکومتیں کبھی بھی عام آدمی کی فلاح و بہبود کو کوئی اہمیت نہیں دیتیں اور صرف یہ کوشش ہوتی ہے کہ کسی نہ کسی طریقے سے بجٹ بن جائے اور اگر ہم اپنے پچھلے وفاقی بجٹ 2026-2025 کے اعداد و شمار پر نظر ڈالیں تو مندرجہ ذیل صورت حال نظر آتی ہے بجٹ برائے 2026-2025 کے مطابق کل خالص تخمینہ 17.573 ارب روپے بنتا ہے اور ان اخراجات کی تفصیل یوں ہے۔ دفاعی بجٹ مبلغ 2550 ارب روپے جو کل اخراجات کا 14.5 فیصد نکلتا ہے۔ قرضوں پر سود کی ادائیگی 18207 ارب روپے جو کل اخراجات کا 46 فیصد بنتا ہے۔ سول انتظامیہ پر 971 ارب روپے، پنشن کے اخراجات 1055 ارب روپے بجلی اور دیگر اخراجات پر 1.186 ارب روپے اور گرانٹ جو غیر ترقیاتی علاقوں اور صوبوں کے لیے دی جاتی ہے وہ ہے 1928 ارب روپے BISP کے حوالے سے کفالت پروگرامز تعلیمی وظائف وغیرہ پر خرچ ہوں گے 716 ارب روپے بنتے ہیں اسی طرح وفاقی حکومت کے اخراجات میں سے 80 ارب گلگت بلتستان 140 ارب آزاد جموں کشمیر 808 ارب خیبر پختون خوا کے بیک ورڈ اضلاع کے لیے 18 ارب روپے بلوچستان کے لیے لیکن یہ گرانٹ کہاں اور کن اخراجات پر خرچ ہوگی اسکی کوئی جانکاری موجود نہیں۔

اب ذرا ان اعداد و شمار پر نظر ڈالیں جنکے بارے لوگوں کو جان کاری ضرور ہونی چاہیے تا کہ لوگوں کو یہ تو علم ہو کہ کیا جو بجٹ ہر سال پیش کیا جاتا ہے کیا وہ ہمیں ترقی کی طرف لے جا رہا ہے اور کیا اس بجٹ میں عام لوگوں کی بھلائی کا عنصر موجود ہوتا ہے ان اعداد و شمار میں سب سے اہم پہلو وفاقی حکومت پر قرضہ جات جو کہ تقریباً 78.5 ٹریلین ہے جو کہ کل قرضہ جات اور ادائیگیوں کے ٹوٹل کے حساب سے 95.5 ٹریلین تک پہنچ جاتا ہے۔ اس رقم میں سے 55.4 ٹریلین وہ قرضہ جات ہیں جو کہ ملک کے اندر سے مختلف بنکوں اور دوسرے اداروں سے حاصل کیے گئے ہیں اور ان میں سے 46.56 ٹریلین لمبے

عرصہ کے قرضہ جات ہیں یعنی جنگی ادائیگی ایک لمبے عرصہ تک ہمارے سروں پر رہے گی اور اس پر ادا کردہ سود مدتوں ادا کرنا پڑے گا اور 8.74 ٹریلین چھوٹے عرصہ کے قرضہ جات ہیں جو کہ فوری اخراجات کے لیے لیے جاتے ہیں اور جس کی رقم ہر سال غیر پیداواری اخراجات کی وجہ سے بڑھتی جارہی ہے اس کے علاوہ 2025 کے بعد کے عرصہ میں غیر ملکی قرضہ جات جو کہ 827 بلین ڈالر تک پہنچ چکے ہیں اور روپیہ کی ٹرم میں ان قرضہ جات میں ہر سال اضافہ چھ فیصد کے حساب سے بڑھ رہا ہے اور ان قرضہ جات کے ہر سال بڑھنے کی وجہ صرف شرح سود کا بڑھتا اور ان قرضہ جات سے وفاقی حکومت کو اپنے Fiscals Deficite کو پورا کرنا ہوتا ہے کیونکہ حکومت کے پاس آمدنی کے ذرائع بڑے محدود ہیں جن کا ذکر آگے آئے گا کیونکہ ہمارے پاس قرضہ جات ہی ایک ایسا ہتھیار ہے جس سے ہم بجٹ کو پورا کرتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ پچھلے 22 مہینوں میں ہم نے 23.7 ٹریلین اضافی قرضہ حاصل کیا ہے اور اس طرح ہم نے اکتوبر تا دسمبر 2025 تک کے 3 مہینوں میں 4.86 بلین ڈالر غیر ملکی قرضہ جات اور سود کی مد میں ادا کیا ہے۔ قرضہ جات اور سود کی ادائیگی پاکستان کی معیشت کا سب سے بڑا مسئلہ ہے اور یہی ہماری معیشت کی سب سے بڑی بیماری ہے جس سے نکلنے کے لیے ہماری تمام حکومتیں کوشش ہی نہیں کرتیں اور آسان راستہ ہے کہ اس مد میں مزید قرضہ جات لیتے رہیں اور بطور ثبوت یہ اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ جو قرضہ جات کی مد میں جو قرضہ 2026 میں 64.8 ٹریلین تھا وہ پچھلے 22 مہینوں میں بڑھ کر 78.5 ملین ہو چکا ہے یعنی پچھلے 22 مہینوں میں بڑھ کر 78.5 ٹرلین ہو چکا ہے۔ یعنی پچھلے 22 مہینوں میں اس مد میں ہمارے اوپر 13 فیصد مزید بوجھ بڑھ گیا ہے جس میں سے 12.7 ٹرلین ملک کے اندر سے اور 1.03 ٹریلین غیر ممالک سے حاصل کیا ہے اور اس مد میں ہمارے اوپر مزید بوجھ بڑھنے لگا جس کی وجہ ہماری کمزور معیشت، کمزور کرنسی ویلیو، ایکسپورٹ کا خاطر خواہ نہ ہوتا اور امپورٹ کا زیادہ ہونا، ایک اور اہم پہلو جو ہمیں بجٹ کو متوازن رکھنے کے لیے اور بین الاقوامی اداروں سے مزید مالی امداد کے حصول کے لیے ریزور رکھنے کے لیے حاصل کئے جانا ضروری ہے جس پر ہمیں ایک اچھی رقم سود کی شکل میں ادا کرنی پڑتی ہے وہ ہے 20.52 ملین ڈالر جس میں سے 15.08 ملین ڈالر سٹیٹ بنک کی پاس رکھے ہوئے اور 5.45 ملین ڈالر کمرشل بنکوں کے پاس ریزور ہیں تا کہ ان کی بنیاد پر بنکوں سے مزید قرضہ حاصل کیا جاسکے۔ یہ رقوم چائنا، سعودی عرب، قطر اور یو اے ای اور اسٹینڈرڈ چارٹرڈ بنک سے وابستہ ہیں۔ اب اسی تناظر میں ہم اپنے ملک کی آمدنی پر نظر ڈالتے ہیں جن میں سر دست ایکسپورٹ ہے موجودہ بجٹ کا اپنے 7 مہینے کی ایکسپورٹ 20.47 بلین ڈالر ہے جو پچھلے سال کے انہی مہینوں سے 7.27 بلین ڈالر کم ہے۔ اس کی وجوہات میں کافی ایشو ہیں لیکن آپ یہ بھی جائزہ لیں کہ ہماری ایکسپورٹ کی چیزیں بہت ہی محدود ہیں اور وہ ہیں ریڈیمیڈ کپڑے مصنوعات، بیڈ شیٹس، پاول کاٹن، تولیہ اور کاٹن کلاتھ تک محدود ہے جو کہ ٹیکسٹائل کی مد میں آتی ہے جو کہ ہماری کل ایکسپورٹ کا 55 فیصد بنتا ہے اس کے علاوہ زراعت میں اہم ایکسپورٹ آئٹم میں آم اور چاول قابل ذکر ہیں جو مڈل ایسٹ یورپ اور جنوبی امریکہ کو بھیجا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں پاکستان سروسز ایکسپورٹ کرتا ہے جو کہ زیادہ تر آئی ٹی اور ٹیلی کمیونیکیشن سے منسلک ہے جو کہ 5.66 بلین ڈالر تک پہنچی۔ اب ایکسپورٹ کی انہی اعداد و شمار کے مقابلے میں امپورٹ کا بھی جائزہ لیں جس کا بیلنس ہمارے خلاف جاتا ہے اور یہ بھی ہماری معیشت کو اوپر انہیں اٹھنے نہیں دیتا اس مد میں پچھلے بجٹ کے حوالے سے ہم نے 9.1 بیلین ڈالر امپورٹ پر خرچ کئے اور امپورٹ میں شامل شدہ اشیاء میں جنگی اسلحہ جس کا زیادہ تر دارومدار چائنہ، ترکی اور چند دوسرے ممالک پر ہے جبکہ آئی ٹی سروسز بھی 5.66 بلین ڈالر کی امپورٹ کرنی پڑی۔ لہذا ان اعداد و شمار کی روشنی میں ہم ایکسپورٹ اور امپورٹ کے اکاؤنٹ میں نقصان میں جارہے ہیں اور اس حوالے سے بجٹ کا جائزہ لیں تو ہمیں بہت کم ایسے منصوبہ جات نظر آتے ہیں جو ہماری معیشت کے اہم جز ا ایکسپورٹ کو بڑھاوا دے سکیں۔ کیونکہ اگر ہم پچھلے 40 سال کا جائزہ لیں تو صورتحال یہ ہے کہ 1977 کے بعد کراچی میں صنعتی ترقی کو بڑھاوا انہیں ملا پھر بجلی کے بحران نے پنجاب میں فیصل آباد گوجرانوالہ اور سیالکوٹ میں بہت سی چھوٹی چھوٹی صنعتیں بند ہونا شروع ہوگئیں اور ابھی تک ہماری حکومتیں اس حوالے سے انرجی کے ایشو کو حل نہیں کر پارہی ہیں اور انہی وجوہات کی بناء پر ہمارے صنعتکار اور کاروباری حضرات اپنا سرمایہ تقریباً 200 ارب ڈالر دبئی میں لے گئے اور جو رہ گئے انہوں نے اپنا سرمایہ زمین کے کاروبار میں لگا دیا جو کہ غیر پیداواری مد میں آتا ہے اور یہ صورتحال ابھی تک جوں کی توں ہے اور ہماری معیشت کا ایک اور اہم پہلو جس کا تعلق عام لوگوں کی زندگی سے ہے وہ ہے تعلیم صحت، ٹرانسپورٹ۔ ان کے اخراجات سے ہماری حکومتیں ہاتھ اٹھا رہی ہیں اور ان شعبہ جات کو زیادہ سے زیادہ پرائیویٹ ہاتھوں میں دے دیتی ہیں جن سے عام لوگوں کی زندگی اجیرن ہورہی ہے اور خاص کر جب روزگار کے مواقع کم سے کم ہورہے ہیں۔ اور اب تک حکومتیں ان مسائل پر کوئی خاطر خواہ حکمت عملی نہیں بنا سکیں اور ان کے معاشی مشیر جو کہ زیادہ تر مختلف بین الاقوامی اداروں کے پروردہ ہیں۔ اس ملک کے مسائل کو سامنے رکھنے کی بجائے ان بین الاقوامی اداروں کی پالیسیوں کے نقطہ نگاہ سے حکومت کو مشورہ دیتے ہیں۔ لہذا ان اعداد و شمار کی روشنی میں حکومت سے سوال کیا جاسکتا ہے کہ کیا آپ ایسی خارجہ پالیسی بنائیں جس سے ہمارا جنگی بجٹ کم سے کم ہو جائے۔ کیا حکومت وہ کونسی معاشی پالیسیاں بنارہی ہے جس سے ہماری ایکسپورٹ زیادہ سے زیادہ ہو جائے اور امپورٹ پر انحصار کم سے کم ہو جائے اور حکومت کے پاس کیا کوئی پروگرام ہے کہ ہمارے سر سے قرضوں کا بوجھ کم ہو جائے اور کیا ملکی صنعتی پالیسی بنائی ہے جس سے ہماری صنعتی پیداوار بڑھتی جائے اور کیا ہم زراعت کی برتری کے لیے کوئی قدم اٹھا رہے ہیں کہ زیادہ آبادی والا سیکٹر ترقی کی طرف گامزن ہو جائے اور سب سے بڑھ کر عام لوگوں کی قوت خرید بڑھانے کے لیے کوئی اقدامات اٹھائے جارہے ہیں۔ مگر ایک بات واضح ہے ہماری صوبائی حکومتیں اور وفاقی حکومت ان تمام مسائل کے حل کے لئے کوئی قدم نہیں اٹھا رہی اور یہ بات اگلے مہینے آنے والے بجٹ سے عیاں ہو جائے گی۔ ان حالات میں لوگوں کو اپنے آپ کو سیاسی طاقت میں ڈھالنا پڑے گا تا کہ ایسے لوگ سیاست میں سامنے آئیں جو ملک کی مجموعی آبادی کا 80% ہے تا کہ 20 ذرائع پیداوار کے مالک لوگوں سے اقتدار واپس لیا جائے۔ ☆☆

کارل مارکس اوران کا فلسفہ بیگانگی

تحریر: اثر امام

کارل مارکس انیسویں صدی کے عظیم فلسفی اور ماہر معاشیات، مؤرخ، صحافی اور انقلابی مفکر تھے۔ وہ 5 مئی 1818 کو جرمنی کے شہر Trier میں پیدا ہوئے۔ ان کے خیالات نے دنیا بھر کی سیاست، معیشت اور سماجی نظریات پر گہرا اثر ڈالا۔ کارل مارکس نے ابتدائی تعلیم اپنے آبائی شہر میں حاصل کی اور بعد ازاں University of Bonn اور University of Berlin میں قانون اور فلسفہ کی تعلیم حاصل کی۔ تعلیم کے دوران وہ فلسفہ، تاریخ اور سیاست میں گہری دلچسپی لینے لگے۔ مارکس نے اپنے قریبی دوست Engels Friedrich کے ساتھ مل کر 1848ء میں مشہور کتابچہ The Communist Manifesto تحریر کیا۔ اس کتاب میں انہوں نے سرمایہ دارانہ نظام پر تنقید کی اور مزدور طبقے کو متحد ہو کر انقلاب برپا کرنے کی دعوت دی۔ اس کا مشہور نعرہ تھا: دنیا کے محنت کشو، ایک ہو جاؤ!"

مارکس کی سب سے اہم کتاب Das Kapital ہے، جس میں انہوں نے سرمایہ دارانہ نظام کی خامیوں، استحصال اور دولت کی غیر مساوی تقسیم کا تفصیلی تجزیہ پیش کیا ہے۔ ان کے مطابق سرمایہ دار مزدور کی محنت سے زائد منافع کماتا ہے، جسے انہوں نے "قدرِ زائد" (Surplus Value) کا نام دیا۔

کارل مارکس کے نظریات یعنی مارکسزم کے مطابق انسانی تاریخ طبقاتی جدوجہد کی تاریخ ہے، یعنی امیر اور غریب، حاکم اور محکوم کے درمیان کشمکش ہمیشہ سے جاری رہی ہے۔ مارکس کا خیال تھا کہ ایک دن مزدور طبقہ سرمایہ دارانہ نظام کو ختم کر کے مساوات پر مبنی معاشرہ قائم کرے گا۔

مارکس نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ جلاوطنی میں گزارا اور آخرکار London میں سکونت اختیار کی، جہاں 14 مارچ 1883ء کو ان کا انتقال ہوا۔ انہیں ہائی گیٹ قبرستان میں دفن کیا گیا۔

کارل مارکس کے خیالات نے Russian Revolution، China، Cuba اور دنیا کے کئی دیگر ممالک کی سیاست کو متاثر کیا۔ آج بھی ان کے نظریات پر بحث جاری ہے اور انہیں دنیا کے عظیم ترین مفکرین میں شمار کیا جاتا ہے۔

کارل مارکس ایک ایسے عظیم مفکر تھے جنہوں نے معاشرے، معیشت اور سیاست کو سمجھنے کا نیا زاویہ دیا۔ اگرچہ ان کے نظریات سے اختلاف کیا جا سکتا ہے، لیکن ان کی فکری خدمات سے انکار ممکن نہیں۔

کارل مارکس جب بون اور برلن کی یونیورسٹیوں میں قانون اور فلسفے کی تعلیم حاصل کر رہے تھے تبھی وہ ہیگل کے فلسفے سے متاثر ہوئے، جن کے نظریات نے ان کی ابتدائی فکر کو تشکیل دیا۔ ان کی فکر، تحریروں اور عملی طور پر محنت کشوں کے ساتھ جڑ جانے کی پاداش میں انہیں جرمنی سے جلاوطن ہونا پڑا۔ پہلے پیرس اور پھر برسلز میں آباد ہوئے، جہاں ان کی دوستی فریڈرک اینگلز سے ہوئی، جو ان کا سب سے قریبی ساتھی اور مالی معاون ثابت ہوا۔ مارکس کو برسلز میں بھی نہیں رہنے دیا گیا اور بالآخر وہ وہاں سے ہجرت کر کے لندن میں آباد ہوئے جہاں انہوں نے اپنی باقی زندگی گزار دی۔ یہاں انہوں نے اپنی مشہور تصانیف تصنیف کیں، حالانکہ ان دنوں وہ انتہائی غربت اور بیماری کا شکار تھے۔

مارکس کے نظریات کا مرکز "تاریخی مادیت" کا تصور ہے۔ اس کے مطابق، کسی بھی معاشرے کی بنیاد اس کا "معاشی ڈھانچہ" ہوتا ہے جس میں پیداوار کے ذرائع اور آپس میں تعلقات شامل ہیں۔ یہ معاشی ڈھانچہ ہی معاشرے کے سیاسی، قانونی اور ثقافتی "بالائی ڈھانچے" کو طے کرتا ہے۔ مارکس کے مطابق پوری انسانی تاریخ کا لس اسٹرگل طبقاتی کشمکش کی تاریخ ہے۔ انہوں نے معاشرے کو بنیادی طور پر دو بڑے طبقات میں تقسیم کیا: · بورژوا۔ سرمایہ دار (پیداوار کے ذرائع) فیکٹریاں، زمین، مشینیں کے مالک۔ دوسرا پرولتاریہ مزدور اپنی محنت کے سوا کچھ نہیں رکھتے اور زندہ رہنے کے لیے اپنی محنت کی طاقت بیچنے پر مجبور ہیں۔

مارکس نے کہا کہ سرمایہ داری میں مزدور اپنی محنت کی پیداوار سے بیگانہ ہو

جاتا ہے۔ وہ جو کچھ بناتا ہے، اس پر اس کی ملکیت نہیں ہوتی، بلکہ وہ ایک اجنبی شے کے طور پر اس کے سامنے آتی ہے۔ اسے مارکس کا نظریہ بیگانگی کہا جاتا ہے۔ انہوں نے اپنی عظیم کتاب " کیپیٹل (Das Kapital) میں سرمایہ داری کے معاشی نظام کا تفصیلی تجزیہ پیش کیا ہے۔ انہوں نے "فاضل قدر Value "Surplus کا نظریہ پیش کیا، جس کے مطابق مزدور مالیت پیدا کرتا ہے لیکن اسے اس کی محنت کی پوری قیمت ادا نہیں کی جاتی۔ باقی ماندہ قیمت فاضل قدر کو سرمایہ دار ہڑپ کر لیتا ہے، جو سرمایہ داری کے منافع کی بنیاد ہے۔

مارکس کا ماننا تھا کہ سرمایہ داری اپنے اندرونی تضادات (مثال: بڑھتی ہوئی غربت کے مقابلے میں دولت کا ارتکاز) کی وجہ سے تباہ ہو جائے گی۔ بالآخر، پرولتاریہ ایک انقلاب کرے گا، سرمایہ داری نظام کا تختہ الٹ دے گا اور "اشتراکیت '' "Socialism قائم کرے گا۔ وقت گزرنے کے ساتھ، اشتراکیت ایک "غیر طبقاتی معاشرے "یعنی" کمیونزم "(Communism) میں تبدیل ہو جائے گی، جہاں نہ کوئی نجی ملکیت ہوگی، نہ طبقات، اور نہ ریاست کی ضرورت رہے گی۔

ماہرین معاشیات کا کہنا ہے کہ مارکس کی فاضل قدر اور قیمتوں کا نظریہ خامیاں رکھتا ہے۔

معاشی طور پر، بہت سے ماہرین اس کے باوجود ان کا اثر بے حد گہرا ہے۔ اس نے مزدوروں کے حالات، عدم مساوات اور استحصال کے خلاف آواز اٹھائی۔ اس کے نظریات نے مزدور یونینوں، فلاحی ریاستوں اور سماجی جمہوریتوں کو متاثر کیا۔ بہت سے مؤرخین اور سماجی سائنسدان آج بھی طبقاتی کشمکش اور معاشی عوامل کو سمجھنے کے لیے مارکس کے تصورات استعمال کرتے ہیں۔

یہ کہ

مختصرا کارل مارکس ایک ایسی شخصیت ہیں جن کی تعریف وتنقید آج بھی جاری ہے۔ تاریخ میں شاید ہی کوئی دوسرا مفکر ہو جس نے طبقاتی جدوجہد، سرمایہ داری اور انقلاب کے بارے میں اتنا گہرا اور متنازعہ تجزیہ پیش کیا ہو۔ چاہے کوئی ان کے نظریات سے متفق ہو یا نہ ہو، جدید معاشرے، عالمی سیاست، اور معاشیات پر ان کے اثرات کو نظر انداز کرنا ممکن نہیں۔ وہ ایک ایسے مفکر ہیں جنہوں نے ہمیں نظامِ سرمایہ داری کے بارے میں مشکل اور ضروری سوالات پوچھنا سکھایا۔ نظریہ بیگانگی (Theory of Alienation) کارل مارکس کے ابتدائی فلسفیانہ کاموں کا مرکز ہے، خاص طور پر ان کی مشہور تصنیف 1844" کے اقتصادی و فلسفیانہ مسودات Manuscripts and phic Philoso of Economic1844 (میں۔ جہاں مارکس کو عام طور پر معاشی اور سیاسی انقلاب کا نظریہ دینے والے مفکر کے طور پر جانا جاتا ہے، وہیں بیگانگی کا تصور اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ وہ سرمایہ داری کے نظام کو انسانی نفسیات اور روح پر کس طرح اثر انداز ہوتے دیکھتے تھے۔ مارکس کے نزدیک، بیگانگی ایک ایسی کیفیت ہے جس میں انسان اپنی تخلیق کردہ اشیاء، اپنی محنت، دوسرے انسانوں، اور سب سے اہم بات، اپنی بنیادی انسانیت سے کٹ کر رہ جاتا ہے۔

بیگانگی کا بنیادی مفہوم: مارکس نے ارسطو اور ہیگل سے متاثر ہو کر ایک بنیادی سوال پوچھا: "انسان کو انسان کیا بناتا ہے؟" ان کے مطابق، انسان دیگر جانوروں سے اس لیے ممتاز ہے کہ وہ "شعوری طور پر" اپنی زندگی کی سرگرمیوں کو انجام دیتا ہے۔ ایک مکڑی جال بُنتی ہے، لیکن وہ غیر شعوری طور پر ایسا کرتی ہے۔ جبکہ ایک انسان اپنے دماغ میں ایک گھر کا نقشہ بناتا ہے، پھر اس نقشے کے مطابق اینٹ اور سیمنٹ سے اسے تعمیر کرتا ہے۔ یہ " تخلیقی عمل" اور اپنی محنت کی پیداوار کو دیکھنے کی "خوشی" ہی انسان کی حقیقی فطرت ہے۔ مارکس اسے "صنفی وجود (Species"-being) کہتے ہیں۔ بیگانگی اس فطری رشتے کے ٹوٹنے کا نام ہے۔ سرمایہ داری میں، یہ تخلیقی عمل اپنی اصلیت سے الٹ جاتا ہے۔ مزدور اپنی محنت کو ایک آزاد تخلیقی اظہار کے بجائے ایک مجبوری اور بوجھ کے طور پر محسوس کرتا ہے۔

مارکس نے اس کیفیت کو چار مختلف پہلوؤں میں تقسیم کیا ہے:

1. اپنی محنت کی پیداوار سے بیگانگی: یہ بیگانگی کی سب سے سمجھ میں آنے والی شکل ہے۔

· کیا ہوتا ہے: مزدور ایک شے پروڈکٹ بناتا ہے، لیکن وہ شے اس کی نہیں ہوتی۔ وہ اسے بیچ دینے پر مجبور ہوتا ہے۔ یہ شے سرمایہ دار کی جائیداد بن جاتی ہے اور بازار میں ایک اجنبی طاقت کے طور پر کھڑی ہو جاتی ہے۔

· مثال: ایک کاریگر خوبصورت موبائل فون اسمبل کرتا ہے، لیکن اس کی اپنی جیب میں وہ پرانا اور ٹوٹا ہوا فون ہے جسے وہ خرید سکتا ہے۔ اس نے جو بنایا، وہ اس سے کہیں زیادہ قیمتی ہے، لیکن وہ اس پر کوئی حق نہیں رکھتا۔ یوں اس کی اپنی محنت کی پیداوار اس کے مخالف ہو جاتی ہے۔

2. خود محنت کے عمل سے بیگانگی: یہ پیداوار سے بھی زیادہ تکلیف دہ ہے کیونکہ یہ کام کرنے کا تجربہ ہی مزدور کے لیے عذاب بنا دیتی ہے۔

سرمایہ داری میں کام ایک (forced labour) ہے، ایک آزاد تخلیقی عمل نہیں۔ مزدور فیکٹری میں ایک خاص مشین کے ساتھ ایک ہی حرکت کو بار بار دہراتا ہے) جیسے اسمبلی لائن پر پیچ کسنا۔ اسے نہ تو اپنی صلاحیتوں کو استعمال کرنے کا موقع ملتا ہے اور نہ ہی فیصلہ کرنے کا۔

· نتیجہ: مزدور کام پر صرف اس لیے جاتا ہے کہ پیسے کما سکے بقا کے لیے۔ جب وہ کام پر ہوتا ہے، تو وہ گھر جانے کا سوچتا ہے۔ وہ صرف آرام کے وقت ہی آزاد محسوس کرتا ہے اور کام کے وقت ایک مشین کا پُرزہ بن جاتا ہے۔

3. اپنی "صنفی وجود" انسانیت سے بیگانگی: یہ پچھلی دو اقسام کا نتیجہ ہے۔

· کیا ہوتا ہے: جب انسان کا تخلیقی عمل (جو اسے انسان بناتا ہے) چھین لیا جاتا ہے، تو وہ اپنی بنیادی فطرت سے کٹ جاتا ہے۔ وہ ایک انسان کی طرح تخلیق کرنے کی بجائے ایک جانور کی طرح زندہ رہنے (کھانا، پینا، سونا) کے لیے کام کرتا ہے۔

· نتیجہ

: انسان وہ کام کرنے لگتا ہے جو جانور بھی کر سکتے ہیں (صرف بقا)، اور جانوروں والی زندگی (آزاد تخلیق کے بغیر) گزارنے لگتا ہے۔

4. دوسرے انسانوں سے بیگانگی: بیگانگی کا آخری مرحلہ معاشرتی تعلقات کو تباہ کر دیتا ہے۔

· کیا ہوتا ہے: چونکہ مزدور اپنی محنت کا پھل نہیں پاتا، یہ پھل کسی اور (سرمایہ دار) کے پاس جاتا ہے۔ یوں مزدور اور سرمایہ دار ایک دوسرے کے مخالف ہو جاتے ہیں۔ مزدور سرمایہ دار کو اپنا استحصال کرنے والا دشمن سمجھتا ہے۔

· نتیجہ: محبت اور تعاون کی جگہ مسابقت اور خود غرضی آ جاتی ہے۔ لوگ ایک دوسرے کو انسان کی بجائے ایک آلہ یا حریف سمجھنے لگتے ہیں۔ معاشرہ ایک مشترکہ برادری کی بجائے اجنبیوں کا میدان بن جاتا ہے۔

حقیقی زندگی کی مثالیں:

· آج کا دفتری کلچر: ایک ملازم کمپنی کے لیے ایک رپورٹ بناتا ہے، لیکن اس پر اس کا نام نہیں لگتا، باس اسے پیش کرتا ہے اور اس کا سارا کریڈٹ لے لیتا ہے۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ اس کی محنت اس سے چھین لی گئی۔

· فاسٹ فوڈ ورکر:

روزانہ آٹھ گھنٹے ایک ہی طرح کے برگر بنانا۔ یہاں نہ کوئی تخلیق ہے، نہ کوئی مہارت۔ ورکر ایک مشین ہے۔

· تعلیم: طلباء نمبروں کی دوڑ میں مشغول ہو جاتے ہیں، علم حاصل کرنے کی خوشی ختم ہو جاتی ہے۔ وہ "سیکھنا" پسند نہیں کرتے، بلکہ اسے صرف "پاس ہونے کا ذریعہ" سمجھتے ہیں۔

نتیجہ اور حل:

مارکس کے لیے بیگانگی کوئی ابدی انسانی کیفیت نہیں، بلکہ سرمایہ داری نظام کی ایک پیداوار ہے۔ جب تک پیداوار کے ذرائع (زمین، فیکٹری، مشین) چند سرمایہ داروں کی نجی ملکیت میں رہیں گے، مزدور بیگانہ رہے گا۔

حل: مارکس نے ایک ایسے معاشرے کا تصور پیش کیا جہاں پیداوار کے ذرائع اجتماعی ملکیت میں ہوں۔ ان کے نزدیک کمیونزم میں، انسان "ذاتی عمل "Praxis کے ذریعے دوبارہ اپنی تخلیقی طاقت حاصل کر لے گا۔ جب انسان اپنی مرضی سے کام کرے گا، اپنی محنت کا پھل دیکھے گا اور دوسروں کے ساتھ مل کر تخلیق کرے گا، تو وہ بیگانگی سے نجات پا کر اپنی حقیقی انسانیت کو دوبارہ حاصل کر لے گا۔

خلاصہ

مارکس کا نظریہ بیگانگی صرف مزدوروں کے خراب حالات کی کہانی نہیں، بلکہ ایک گہرا نفسیاتی اور فلسفیانہ اعتراض ہے کہ کس طرح سرمایہ داری انسان کو اس کے تخلیقی جوہر سے دور کر کے اسے ایک مشین کا پرزہ بنا دیتی ہے

☆.....☆

نظریاتی، سیاسی، تنظیمی جڑت اور بنیادی سماجی تبدیلی

تحریر: رانا اعظم

ہمارے لئے سیاسی جماعت کے سادہ سوال کو الگ الگ حصوں میں کر کے دیکھنا یوں ضروری ٹھہرا کہ مارکسی فلسفہ درست طور پر یہ کہتا ہے کہ کسی بھی سماج کی بنیاد اس کا پیداواری نظام جو ذرائع پیداوار اور تقسیم کے رشتوں سے مل کر تشکیل پاتا ہے۔ اسے سماج کا سٹرکچر، بنیاد بھی کہا جاتا ہے۔ سماج کا دوسرا لازمی حصہ سائنسی، غیر سائنسی (طبیعاتی، مالعبدالطبیعاتی) علوم کی تمام شاخیں، فلسفہ، سیاسی نظریات، جماعتیں نظام حکومت، قانون قاعدے، علم وادب کے ادارے سب مل کر سپر سٹرکچر، بالائی ڈھانچہ بناتے ہیں۔ سپر سٹرکچر بنیادی طور پر پیداواری نظام کی ترقی کی مناسبت سے آگے بڑھتا ہے۔ یہ بات سو فیصد درست ہونے کے باوجود مکینیکل نہیں ہوتی۔ بعض غیر معمولی حالات میں بالائی ڈھانچہ پرائمری حیثیت اختیار کر جاتا ہے۔ غیر معمولی حالات سے ہماری مراد تبدیلی کے حالات ہیں، جب اقتدار پر قبضہ کی سیاسی جنگ ابھر کر جدوجہد کا سوال نمبر ایک بن جاتا ہے۔ ان غیر معمولی حالات کو پیدا کرنے میں سماج کی باشعور، ترقی پسند سیاسی، سماجی، قوتیں کردار ادا کرتی ہیں۔ جدید صنعتی دور میں یہ تمام قوتیں یکجا ہو کر ایک منظم سیاسی جماعت کی شکل میں سماج کے استحصال زدہ، پچھڑے ہوئے، میلے کچیلے محنت کش عوام کے استحصال کے خاتمے نمائندہ کے لیے سماجی تبدیلی میں بنیادی کردار ادا کرتی ہے۔ اس ترقی پسند قوت کے منظم اور موثر کردار کے بغیر کوئی سماجی تبدیلی وقوع پذیر نہیں ہو سکتی۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ استحصالی تاناشاہ بغیر ایجنٹ، دایہ (Catalyst) کے تبدیلی کا تاریخی عمل خود بخود تکمیل پا جائے۔ ہمارا ماننا ہے کہ اس سماجی انقلابی تبدیلی جنگ کے عمل میں حکمران اشرافیہ اور محنت کش عوام کے اپنے اپنے سیاسی، سماجی نظریات کا جنم ہوتا ہے اور یہ نظریاتی و سیاسی فلسفہ معروضی حالات کی مناسبت سے ایک بار جنم لے لیتا ہے اور یوں یوں محنت کش عوام انہیں شرف قبولیت بخشتے جاتے ہیں توں توں یہ مادی قوت میں ڈھلتے جاتے ہیں۔ تب یہ سٹرکچر کا پابندی کی پرواہ کیے بلکہ الٹا سٹرکچر میں بھی ترقی پسند تبدیلی کے عمل پر اثر انداز ہوتا ہے۔ تب سیاست ایک مرحلہ پر ہراول کا رول اختیار کر لیتی ہے۔ یہی وہ غیر معمولی حالات ہوتے ہیں۔ آیئے دیکھتے ہیں کہ محنت کش طبقہ کے سیاسی، سماجی نظریات ایک منظم قوت (سیاسی جماعت) کی شکل میں دایہ کا کردار ادا کرتے ہیں۔

ہر طبقاتی سماج بنیادی طور پر دو متحارب قوتوں، طبقوں کا حامل ہوتا ہے۔ پیداواری قوتوں کی ملکیت رکھنے والی حکمران اشرافیہ اور ان سے محروم، جن کے پاس بیچنے کے لیئے صرف ان کی قوت محنت ہوتی ہے یعنی محنت کش طبقہ کی پیداوار کرنے قوت۔ یہ ہر دو قوتیں ہمیشہ جدل میں رہتی ہیں۔ یہ کشمکش، جدل، جنگ اپنے معروضی اور موضوعی حالات کے سبب کبھی تیز اور کبھی سست شکل میں لڑی جا رہی ہوتی ہے۔ اس جنگ میں دونوں متحارب طاقتیں صف بند ہوتی ہیں اور اپنے اپنے لانگ اور شارٹ ٹرم اتحادی بھی تلاش کرتی ہیں اور اپنے طرفدار سماجی علوم کی مختلف شاخوں فلسفہ، تاریخ، سائنس، سیاسی نظریات کو بطور ہتھیار استعمال میں لاتی ہیں۔ اس جنگ میں ذرائع پیداوار پر قابض استحصالی قوت کو ریاستی طاقت اور مذہبی قوتوں کے سیاسی استعمال کی شکل میں اضافی برتری بھی حاصل ہوتی ہے۔ یوں دونوں مدمقابل قوتیں اپنے اپنے مفاداتی نظریات کو عوام کی قبولیت کی غرض سے زیادہ سے زیادہ پھیلانے میں کوشاں رہتی ہیں۔ دونوں متحارب طاقتیں اپنی اپنی سیاسی جماعتوں کو اپنے اپنے مفاداتی نظریات سے لیس کر کے میدان میں اتارتی ہیں۔ یہ میدان جنگ دو سطحوں سیاسی اور نظریاتی (IdeasOf Battle) پر سجتے ہیں۔ یہاں سے نظریات، سیاست اور سیاسی جماعتوں کا مادی قوت کے طور پر کردار شروع ہو جاتا ہے۔ ان متحارب طاقتوں میں سے جو اپنے آپ کو زیادہ منظم اور موثر شکل دے لیتی ہے، وہ یہ جنگ جیت جاتی ہے۔ اب ہم نے محنت کش طبقہ کی نمائندہ قوت کے طور پر فیصلہ کرنا ہے کہ کیسے اپنی نظریاتی، سیاسی طاقت کو جماعتی شکل میں بہتر طور پر منظم شکل دیں؟ کیسے نظریات، سیاست اور تنظیم کے باہمی رشتے کو مضبوط جڑت کی شکل دیں تا کہ موثر طاقت کا کردار ادا کر سکے۔ ایک اور بات بھی واضح کرتے چلیں کہ آج کی معروضات صرف بائیں بازو کی تنظیم اور ان کے اتحادیوں تک محدود نہیں ہے۔ حاکم طبقوں اور ان کی اتحادی سیاسی، مذہبی قوتوں، تنظیموں پر بھی بات کریں گے کہ یہ کیسے سماج کو پچھاڑنے کا کام کرتی ہیں۔

محنت کش طبقے کے ساتھی کے طور پر ہم اپنی ہر دوسری تحریر میں نظریاتی، سیاسی اور جماعتی رشتے کے مضبوط بندھن پر کسی نہ کسی حوالے سے اپنے دیگر ساتھیوں کی خدمت میں کچھ نہ کچھ رکھنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ ہمارے جیسے حالات میں یہاں محنت کش طبقے کی تحریک سیاسی اور تنظیمی قوت کے طور پر کمزور ہے۔ ہاں ہماری یہ بھی سوچ ہے کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ کسی ایک ہی وقت اور مقام پر نظریاتی پھیلاو اور سیاسی تنظیم کی طاقت میں فرق ہو۔ پاکستان میں ہم ایسا فرق محسوس کرتے ہیں۔ آپ کو تنظیم میں پروئے ہوئے ساتھیوں کی نسبت، باہر بیٹھے دوست زیادہ نظر آئیں گے۔ تنظیمی کمزوری کے وقت میں یہ دوست آپ کے ساتھ نہیں آئیں گے لیکن بہت سے لوگ ہوتے ہیں جو صرف اچھے وقتوں کے ساتھی ہوتے ہیں۔ بنیادی اصول یہ ہے کہ آپ اپنے دشمنوں کو کم سے کم کرتے جائیں۔ جس حد تک ممکن ہو سکے انہیں قریب رکھنے کی ہماری طرف سے کوششیں جاری رہنی چاہیں۔ ہاں جب کبھی جہاں کہیں آپ نظریاتی کجرویاں دیکھیں تو ان پر گرفت کرنے میں کسی قسم کی وقتی مصلحت یا سمجھوتہ بازی آڑے نہیں آنی چاہیے۔ باہر بیٹھے دوستوں میں نظریات اور تنظیم کے باہمی رشتے کی اہمیت کا فقدان ہوتا ہے۔ ہمارا کام ہے کہ اس نظریاتی ضرورت کو اجاگر کرتے رہیں۔ اکثر یہ ساتھی بائیں بازو کی طرف غیر دوستانہ اور اکثر تنقیدی رویہ بھی رکھتے نظر آتے ہیں جس کا پہلے سے کمزور تنظیمی شکلوں کو اور بھی نقصان پہنچتا ہے۔ ہمارے ان دوستوں کو بھی اس بات کا احساس ہونا چاہیے کہ ان کے اس رویہ سے عوام کی نظروں میں محنت کشوں کے نمائندہ سیاسی اور جماعتی کارکنوں کی credibility اور

integrity مجروح ہوتی ہے۔خواہ ان کا یہ عمل لاشعوری ہی کیوں نہ ہو۔ان کا یہ عمل نئے کاڈر میں مایوسی پھیلانے کا موجب بھی بنتے ہیں۔وہ یہ بات سمجھنے کو تیار ہی نہیں ہوتے کہ ان کے انفرادی نظریات اور جذبے خواہ کتنے ہی سچے اور توانا کیوں نہ ہوں۔وہ تنظیم سے الگ رہ کر کسی طور بھی سماجی تبدیلی کے ایجنٹ کا چھوٹے سے چھوٹا کردار بھی نہیں رکھتے ہوتے۔عمومی طور پر ایسے انفرادی رویوں کو مارکسسٹ لیننسٹ تعلیمات میں پیٹی بورژوا کہا جاتا ہے۔پیٹی بورژوا کی اصطلاح صرف اقتصادی معنوں میں ہی نہیں ہوتی، سیاسی اصطلاح میں بھی پیٹی بورژوا رویے ہوتے ہیں۔بے شک اقتصادی معنوں میں وہ پیٹی بورژوا کلاس سے تعلق نہ بھی رکھتے ہوں۔یہ بھی لازم نہیں کہ صرف تنظیم سے باہر کے لوگ ہی پیٹی بورژوا رویے رکھتے ہوتے ہیں۔تنظیم کے اندر بھی قدم قدم پر آپ کو ایسے رویوں اور عناصر سے واسطہ پڑتا رہتا ہے۔پہلے مرحلہ پر ہم تنظیم سے باہر کے دوستوں کو کہنا چاہتے ہیں کہ انفرادی نظریات تنظیم کا حصہ بن کر ہی مادی قوت میں ڈھلتے ہیں جو استحصالی نظام کو ڈھانے، گرانے کے قابل ہوتے ہیں۔ہم یہ بھی نہیں کہتے کہ بائیں بازو کی تنظیمیں کوئی کی دودھ کی دھلی ہوئی ہیں۔ان کے اندر بھی بہت سے مسائل ہوتے ہیں لیکن ایسے مسائل سیاسی عمل میں ہی دور ہوں گے۔ تنظیموں کی کمزوریوں کو ماننے کے باوجود بھی، ہماری رائے ہے کہ آپ دوستوں کا باہر بیٹھنا کسی طور بھی محنت کش طبقہ کی خدمت نہیں ہے۔اندر والوں کے پیٹی بورژوا رویے بھی تنظیم میں رخنوں، دراڑوں کا موجب بنتے ہیں۔

اب تک کی گفتگو میں ہم نے نظریاتی زمروں (categories) میں باہم موثر رشتے اور عوامی جمہوری تبدیلی میں ان کے کردار کا نظریاتی سطح پر جائزہ لیا ہے۔

لیکن جب بھی ہم کسی معاشرتی، سماجی تبدیلی کے عمل میں پڑتے ہیں تو ہمیں کچھ ٹھوس/مادی زمینی حقائق کا سامنا کرنا پڑتا ہے لہٰذا حقائق کی صرف نظریاتی تشریح وتعبیر کافی نہیں ہوتی۔فریڈرک اینگلز "اینٹی ڈیورنگ" میں کہتا ہے کہ ہمیں ان ٹھوس حقائق کو غنچہ دے کر گزرنے کی بجائے پھلانگ کر عبور کرنا چاہیے۔مطلب زمینی حقائق پر عبور کا پہلا مرحلہ جانکاری ہے۔دوسرے مرحلے میں انقلابی جماعت کا کام ہے کہ وہ حقائق کے اس علم کو تبدیلی کے عمل میں محنت کش تحریک کے زیر استعمال لائیں۔پہلا ٹھوس سوال یہ جاننا ہے کہ ہمارا سماج اپنی سماجی، معاشی، سیاسی، ثقافتی ترقی کی کس سطح یا مرحلہ پر ہے؟ پیداواری قوتوں کی ترقی اور تقسیم پیداوار کی کیا شکل ہے؟ بنیادی طور پر یہی سماجی سطح ہمیں تبدیلی کے طبقاتی کردار، پارٹی کی ساخت، پروگرام، لائحہ عمل، ڈکشن اور نعروں کے تعین میں رہنمائی کرتی ہے۔یہ نہیں ہوسکتا کہ سماج قبائلی ہو یا نیم قبائلی، نیم جاگیردارنہ باقیات کا حامل ہو تو ہم پرولتاری اور محنت کش کی اصطلاحات میں امتیاز یا فرق کو مدنظر بھی نہ رکھیں لیکن یہ بات بھی نظروں سے اوجھل نہیں ہونی چاہیے کہ بلاخر ہماری منزل مقصود کیا ہے؟۔ (آپ کو یاد ہوگا کہ 1969-70 میں پنجاب کی یونیورسٹیوں اور کالجز میں کچھ پروفیسرز حضرات نے "پرولتاری گروپ" کے نام سے بائیں بازو کی سیاسی تنظیم بلکہ باضابطہ پارٹی بھی کہا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔یہ دوسری بات کہ اس گروپ کی پہچان ہمیشہ "پروفیسر گروپ" کے نام سے ہی رہی ہے۔اوپر سے گروپ کے تمام صف اول کے رہنما باقاعدہ سروس میں بھی تھے۔یہ گروپ 1988 تک چلا۔یہاں اس کے ذکر کا مقصد محض گروپ کے نام اور زمینی حقائق کے تضاد کو اجاگر کرنا ہے۔ورنہ ہم ان سینئر ساتھیوں کے نیک، بھلے جذبات اور contribution کا احترام کرتے ہیں۔ ایسے کئی ایک دیگر سوالات کا ٹھوس علم حاصل کیے بغیر ہم اپنی نظریاتی، سیاسی اور تنظیمی ضرورتوں کا درست تعین نہیں کر سکتے۔سماج کی سوشیو اکنامک سطح کا درست علم ہمیں اپنے دوستوں، دشمنوں اور متحارب قوتوں کی طاقت کے ناپ تول میں مدد فراہم کرتا ہے۔

سماجی تبدیلیاں ہماری ابلتی خواہشوں یا حد سے بڑھی فرسٹریشن کی پابند نہیں ہوتیں اور نہ ہی ہمیں سہل پسندی، غیر ذمہ دارانہ پیٹی بورژوا رویوں، پارسائی sectarianism یا نظریاتی آزاد خیالی/آوارہ گردی کی عیاشی کی اجازت دیتی ہیں۔

چلیں آئیں دیکھتے ہیں کہ پاکستانی سماج کس سطح پر کھڑا ہے۔پاکستان 1947 میں ایک الگ ملک کے طور پر معرض وجود میں آیا۔پاکستان ایک سے زیادہ قومیں، زبانیں، نسلیں، ثقافتیں اور مذاہب رکھنے والا ملک ہے۔سیاسی زبان میں پاکستان کثیر القومی، کثیر اللسانی، کثیر الثقافتی اور کثیر المذہبی ملک ہے۔یہ بھی درست ہے کہ پاکستان کی 95 فیصد سے بھی زائد آبادی مسلم ہے۔یہ الگ بات ہے کہ روز اول سے پاکستان کی سول ملٹری حکمران اشرافیہ کی حد سے بڑھی ہوئی مرکزیت پسندی کی خواہش، کثیر القومی ریاستوں کے وسائل پر ان قوموں کی اول ملکیت کے اصول، جمہوری ادب آداب، اور تقاضوں کو سمجھنے ماننے یا قبول کرنے میں آج تک روکاوٹ بنی ہوئی ہے۔پاکستان کی حکمران قوتیں خود بھی جاگیردار تھیں اور ہیں۔جتنی یہ قوتیں خود بوسیدہ تھیں اور ہیں، اتنے ہی بوسیدہ قبائلی جاگیردارانہ معاشی نظام کو باقی رکھنے میں ان کے مادی، غیر مادی مفادات تھے اور ہیں۔ پاکستان کے ان فیصلہ سازوں نے سماجی پچھاڑ میں اپنا کردار ادا کرنے میں کوئی رحم نہیں کھایا پاکستان صنعتی اعتبار سے پچھڑا ہوا ملک ہے۔چلیں جس شکل میں بھی ہے، اسی کو سامنے رکھتے ہوئے، ہمارا ماننا ہے کہ پاکستان میں جو بھی صنعتکاری کا عمل ہوا ہے۔اس میں بنیادی اور بھاری صنعتیں نہ ہونے کے برابر ہیں۔یہی بھاری اور بنیادی (مینوفیکچرنگ) صنعتیں کسی بھی سماج کے صنعتی عمل کی ریڑھ کی ہڈی ہوتی ہیں۔ ہمارا صنعتی عمل مینوفیکچرنگ کے شعبہ کے نہ ہونے کے سبب پچھڑا ہوا ہے لیکن اس کے باوجود پاکستانی معاشرہ میں اربنائزیشن اور مڈل کلاس کی موجودگی بھی بخوبی ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔اس دور میں ہم حقیقی صنعتی سماج کی بجائے محض صارف consumer سوسائٹی کہتے ہیں۔جو صرف اشیاء صرف درآمد کر کے اپنی مڈل کی ضروریات کو پورا کرتی ہے۔سماج اور حکمرانی کی موجودہ شکل میں نیولبرل ازم (فری مارکیٹ اکانومی) کا فیصلہ ہوگا کہ ٹریڈ یونین بنتی ہے یا نہیں، اگر بنتی ہے تو کس شکل اور کن رولز ریگولیشنز کے تحت۔

ہم نے اوپر پاکستانی سماج کا ترقی کے اعتبار سے عمومی ذکر کیا ہے۔اب ہم تھوڑا گہرائی میں دیکھتے ہیں کہ ہم کیوں کہتے ہیں کہ پاکستان ایک قبائلی، جاگیردارانہ اور نیم صنعتی سماج ہے۔قبائلی، جاگیردارانہ مفادات کو بالادستی حاصل ہے۔پارلیمنٹ جب جب بنتی رہی ہے، جاگیرداروں سے بھری ہوتی ہے۔ قیام پاکستان کے وقت ہمارے انتہائی پسماندہ مسلم نوابوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کے مقدر کا فیصلہ اپنے معاشی مفادات کے تحفظ کو مدنظر رکھتے ہوئے کیا کہ کیسے ان کی اپنی جاگیروں کا تحفظ ہوسکتا ہے۔ آج بھی

پاکستان میں 67 فیصد کسان 5 ایکڑ یا اس سے کم کے مالکان ہیں، یہ کل اراضی کے 18 فیصد کے مالک ہیں۔ 23 فیصد کسان 5 سے 12 ایکڑ تک کے مالک ہیں۔ ان کے پاس کل زرعی اراضی کا 25 فیصد ہے۔ 50 سے 100 ایکڑ تک کے مالکان اراضی 1 اعشاریہ 44 فیصد ہیں۔ 150 یا اس سے زائد کے مالکان 0 عشاریہ 23 فیصد ہیں جو کل زرعی اراضی کی 16 فیصد ملکیت رکھتے ہیں۔ 150 ایکڑ سے زائد کا مطلب ہزاروں ایکڑ تک کے مالکان ہو سکتے ہیں۔

صوبہ وار ملکیت دیکھیں تو سندھ میں 0 عشاریہ 3 فیصد وڈیرے 150 ایکڑ یا اس سے زائد کے مالک ہیں۔ سندھ کی کل زرعی اراضی کے 15 فیصد کے مالک ہیں۔ اسی طرح بلوچستان کے 150 ایکڑ یا اس سے زائد کے مالکان کے 0 عشاریہ 5 فیصد کے پاس بلوچستان کے کل قابل کاشت رقبہ کا 7 فیصد ہے۔ خیبر پختونخواہ میں 648 فارم ایسے ہیں جن کی زمین 100 ایکڑ سے زائد ہے صوبے کی کل اراضی کا تقریباً 1 فیصد ہے۔ پنجاب کے 150 ایکڑ یا اس سے زائد کے مالکان تقریباً 0 عشاریہ 1 فیصد کے پاس صوبے کی کل زرعی اراضی کا تقریباً 5 فیصد کے برابر ہے۔ یہ اعداد و شمار 2024 کی زرعی مردم شماری کے ہیں۔ اس سروے میں بیعنامی کی کیا صورت ہے۔ ہم نہیں جانتے۔ ایسے تمام سروے ہماری آنکھوں میں ایک اور پہلو سے دھول جھونکتے ہیں۔ یہ سروے افراد کی ملکیت بتاتے ہیں نہ کہ خاندان کی۔ عالمی بنک کی حالیہ رپورٹ کے مطابق پاکستان کی 44 عشاریہ 7 فیصد آبادی خط غربت سے نیچے زندگی گزار رہی ہے۔ مطلب دو ڈالر سے بھی کم آمدنی پر گزارہ کرتی ہے۔ یہ بھی دلچسپ حقیقت ہے کہ جو خط غربت کے پیمانہ سے ایک cent اوپر ہوتے ہیں۔ وہ کتنے فیصد ہوں گے۔ سکول جانے کی عمر کے ڈھائی کروڑ سے زائد بچے سکولوں سے باہر ہیں؟۔ کیوں پاکستان میں قرارداد مقاصد ضروری تھی۔؟ کیوں ہمارا پہلے دن سے امریکی سامراجی معاہدوں سیٹو سینٹو سے بندھ جانا ضروری سمجھا گیا؟ کیوں مشرقی پاکستان کے زر مبادلہ سے مغربی پاکستان میں پی ائی ڈی سی کے ذریعے صنعتیں لگا کر مغربی پاکستان کے 22 خاندانوں کے حوالے کی گئیں؟ ان بائیس خاندانوں میں جنرل ایوب اور اس کا سمدھی جنرل حبیب اللہ گوہر ایوب کے سسر بھی شامل ہیں۔ کیوں 8 فیصد سے بھی کم اردو بطور مادری زبان بولنے والوں کی زبان کو کلے پڑھا کر 56 فیصد بنگالی پاکستانیوں پر تھوپا جانا لازم سمجھا گیا؟ پاکستان کا سیکیورٹی سٹیٹ بنایا جانا کیوں ضروری تھا؟ عسکری اسٹیبلشمنٹ کی معاشی اور سیاسی بالادستی کیوں ضروری ہے؟ یہ ہے ہمارا پاکستانی معاشرہ جس میں ہم انقلابی تبدیلی کا عزم لیے ہوئے ہیں۔ اس جاگیردارانہ، قبائلی طبقاتی اور مذہبی فرقہ ورانہ معاشرے میں پارٹی کی شکل وصورت کیا ہوگی یا ہونی چاہیے۔ یہ بھی ذہن نشین کرنے والی بات ہے کہ پوری 20 ویں صدی ایسے انقلابات کی صدی ہے جو ہمارے جیسے پسماندہ معاشروں میں آئے ہیں یا لائے گئے ہیں۔ یہ بھی اہم حقیقت ہے کہ پاکستان کی 33 فیصد سے زائد آبادی شہروں میں بستی ہے۔ بے شک اس کا ایک قابل ذکر حصہ جھونپڑیوں میں ہی کیوں نہ رہ رہا ہو لیکن مڈل کلاس ضرور صارف سوسائٹی کی تعریف میں آتی ہے۔ اس کے باوجود سوسائٹی کے اربن حصہ کے رول کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا ہمیں فیصلہ کرنا ہے۔ یقیناً ایسے اہم فیصلے فرد واحد کے کرنے کے نہیں ہیں بلکہ مجموعی بائیں بازو کی سطح پر حل نکالنے کے ہیں۔ بات یہاں تک آ کر رک نہیں جاتی۔ ہمارے جیسے تیسری دنیا کے پسماندہ ممالک میں سرمایہ دارانہ ترقی کے نتیجہ میں ہماری طرح کے معاشرے کثیر القومی ہوں یا نہ بھی ہوں۔ ایسے معاشروں میں جو بھی تھوڑی بہت ترقی ہوتی ہے، وہ غیر ہموار uneven ہوتی ہے۔ کچھ قومیں یا علاقے آگے نکل جاتے ہیں اور کچھ بہت پیچھے رہ جاتے ہیں چونکہ نجی سرمایہ دار اپنی سرمایہ کاری وہاں کرتا ہے جہاں اسے زیادہ منافع کی امید ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں بھی ایسی ہی صورت ہے۔ ایسی صورت قومی سوال کو جنم دیتی ہے۔ بائیں بازو کی قوتوں کے کمزور یا عدم موجودگی کی بنا پر یہ قومی سوال پچھڑی ہوئی قوموں کی بورژوازی کے ہاتھ میں چلا جاتا ہے۔ وہ اپنے طبقاتی مفاد کو اولیت دیتے ہوئے وہ طبقاتی اور قومی سوال کو باہم جوڑ کر سیاست کو آگے بڑھانے کی بجائے قوم پرستی کی سیاست کے بیانیے کو حاوی شکل دے کر طبقاتی سیاست کو پچھلے بنچوں پر دھکیل دیتا ہے۔ یہ صورت ہمیں کل کے مشرقی پاکستان اور آج کے پاکستان میں سوائے پنجاب کے دیگر صوبائی اکائیوں میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ ہمارا یہ کہنا بلکل بھی نہیں ہے کہ پنجاب میں طبقاتی سیاست کا جادو سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ بالکل بھی ایسا نہیں ہے۔ پنجاب کے ترقی پسندوں کو اور قسم کے بہت سے مسائل کا سامنا ہے۔ وہ بھی مقابلتاً پسماندہ رہ جانے والی قوموں اور علاقوں کا مختلف سیاسی سماجی وجوہات کی بنا پر ساتھ دینے میں ناکام رہتی ہے۔ پسماندہ قوموں یا صوبائی اکائیوں کے ترقی پسند کارکن قومی سوال کو طبقاتی جدوجہد سے جوڑنے کی سیاست کی بجائے قوم پرستی کے دباؤ کا شکار ہو کر اپنی قومی بورژوازی کے ساتھ کھڑا ہونے میں بہت کمفرٹ، آسودگی محسوس کرتا ہے۔ مشرقی پاکستان کی بائیں بازو کی تاریخ پر غور کریں تو نظر آتا ہے کہ جب تک قومی آزادی کی گونج بلند نہیں ہوئی تھی، تب تک مشرقی پاکستان میں کمیونسٹ پارٹی اگر کوئی بہت بڑی نہ بھی تھی پھر بھی قابل ذکر، واضح شناخت رکھتی تھی۔ آج نام کی حد تک رہ گئی ہے باوجود کہ پارٹی آزادی کی جدوجہد میں اپنی بنگالی قوم کے شانہ بشانہ رہی۔ آج بنگالی محنت کش عوام کی حالت بھی جوں کی توں ہے۔ ہماری گفتگو کا بنیادی مدعا پاکستان میں پارٹی کی شکل وصورت کیسی ہونی چاہیے۔ پارٹی کا سوال نظریاتی وسیاسی عمل کے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ یہ عمل یکطرفہ نہیں، دوطرفہ یعنی جدلی ہوتا ہے۔ ہم کہنا یہ چاہتے ہیں کہ جیسے جیسے نظریاتی، سیاسی جدوجہد حقیقی معنوں میں آگے بڑھتی جاتی ہے مطلب کہ سماج کی مختلف استحصال زدہ پرتوں کو پارٹی اپنے اندر سموتی جاتی ہے ویسے ویسے پارٹی کا نظریاتی، سیاسی اور تنظیمی ڈھانچہ بھی اس جدوجہد کے اندر سے نمو پاتا اور جوان ہوتا جاتا ہے۔ ہم اپنے طبقاتی فرنٹس کو مضبوط بنانے کے عمل میں بہت سنجیدگی کے ساتھ محنت کر رہے ہیں۔ ایک ڈائنامک، آرگینک پارٹی ہی جس کا سماج کی نبض پر ہاتھ ہوتا ہے وہ اپنے آپ کو سماجی تبدیلی کے عمل کو گرفت میں لینے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اس وقت ہم بہت sincerity کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ عوامی ورکرز پارٹی اس صلاحیت کی حامل ہے۔ پارٹی نے اپنے دستور ومنشور اور سیاسی دستاویزات میں ایسے رہنما اصول وضع کیے ہیں جو حالات کے مطابق پارٹی بنانے کے عمل میں رہنمائی فراہم کرتے ہیں۔ ہم یہ تو نہیں کہتے سب کچھ آئیڈیل

ترقی پسند سیاست کے بدلتے زاویے

تحریر: منظر گردیزی (اسلام آباد)

ہے لیکن اس منزل کو حاصل کرنے کی راہ پر ضرور گامزن ہیں۔☆☆

پاکستان میں ترقی پسند سیاست کی تاریخ ایک ایسی داستان ہے جس میں امید، جدوجہد، قربانی اور پھر بتدریج کمزوری اور تقسیم کے عناصر ایک ساتھ نظر آتے ہیں۔ یہ صرف نظریات کی لڑائی نہیں تھی بلکہ طاقت، مفادات، ریاستی پالیسیوں اور عالمی حالات کے پیچیدہ امتزاج کا نتیجہ تھی۔ اگر اس پورے عمل کو سمجھنا ہو تو اسے محض چند افراد کی موقع پرستی یا کسی ایک سازش تک محدود کرنا حقیقت کو سادہ بنا دینا ہوگا؛ اصل تصویر اس سے کہیں زیادہ گہری اور پیچیدہ ہے۔

ابتدائی طور پر پاکستان میں ترقی پسند سیاست خاص طور پر طلبہ اور مزدور تحریکوں کے ذریعے ابھری۔ نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن (NSF) اس کی نمایاں مثال تھی، جو نہ صرف ایک طلبہ تنظیم تھی بلکہ ایک نظریاتی نرسری بھی تھی جہاں سے سیاسی شعور رکھنے والے کارکن پیدا ہوتے تھے۔ اس دور میں ترقی پسند سیاست ایک منظّم قوت کے طور پر سامنے آئی، مگر وقت گزرنے کے ساتھ یہی قوت مختلف دھڑوں میں تقسیم ہونے لگی۔

اس تقسیم کی ایک بڑی وجہ ریاستی پالیسی اور دباؤ تھا۔ خاص طور پر جنرل ضیا الحق کے دور میں بائیں بازو کی سیاست کو ریاست کے لیے خطرہ سمجھا گیا۔ طلبہ یونینز پر پابندی، کارکنوں کی گرفتاریاں، اور نظریاتی سرگرمیوں پر قدغنوں نے اس تحریک کی بنیادیں ہلا دیں۔ جب کسی تحریک کی تنظیمی ساخت کو توڑا جائے تو وہ صرف نظریے کی بنیاد پر زیادہ دیر قائم نہیں رہ سکتی، اور یہی کچھ یہاں بھی ہوا۔

دوسری طرف عالمی سطح پر جاری سرد جنگ نے بھی اس تقسیم کو گہرا کیا۔ ایک جانب امریکہ اور اس کے اتحادی سوشلسٹ نظریات کے خلاف تھے، جبکہ دوسری جانب سویت یونین اپنے اثر ورسوخ کو بڑھانا چاہتا تھا۔ اس عالمی کشمکش کا اثر پاکستان جیسے ممالک پر بھی پڑا، جہاں ترقی پسند تنظیمیں مختلف نظریاتی لائنوں میں بٹ گئیں۔ کچھ سوویت یونین کے قریب ہوگئیں، کچھ چین کے نظریات سے متاثر ہوئیں۔ یوں ایک مشترکہ مقصد رکھنے کے باوجود راستے جدا ہوتے گئے۔

تاہم یہ کہنا بھی درست نہیں ہوگا کہ تمام تقسیم بیرونی دباؤ کا نتیجہ تھی۔ اندرونی سطح پر بھی نظریاتی اختلافات موجود تھے۔ مارکسزم، ماؤ ازم، قومی سوال اور طبقاتی جدوجہد جیسے موضوعات پر اختلافات نے تنظیمی اتحاد کو کمزور کیا۔ ہر گروہ خود کو درست سمجھتا تھا، اور یہ یقین آہستہ آہستہ برداشت کی کمی اور تقسیم میں بدل گیا۔

اس کے ساتھ ساتھ قیادت کا کردار بھی اہم رہا۔ کچھ رہنماؤں نے اپنی علیحدہ پہچان بنانے اور اثر ورسوخ بڑھانے کے لیے الگ گروپ تشکیل دیے۔ یہاں وہی رجحان سامنے آیا جس کی طرف اکثر تنقید کی جاتی ہے کہ نظریے کو ذاتی مفاد کے لیے استعمال کیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ بعد میں بہت سے بائیں بازو کے سیاسی کارکن مختلف سیاسی جماعتوں میں شامل ہوگئے، جیسے پاکستان پیپلز پارٹی، عوامی لیگ، مزدور کسان پارٹی، عوامی نیشنل پارٹی، عوامی ورکرز پارٹی اور حالیہ دور میں پاکستان تحریک انصاف۔ اس عمل کو کچھ لوگ موقع پرستی کہتے ہیں، جبکہ کچھ اسے سیاسی ارتقاء قرار دیتے ہیں۔ مگر اس کا نتیجہ بہرحال سوشلسٹ تحریک کی کمزوری کی صورت میں نکلا۔

پاکستان کے سماجی ڈھانچے نے بھی اس صورتحال میں اہم کردار ادا کیا۔ ایک ایسا معاشرہ جہاں جاگیردارانہ نظام، برادری ازم اور مقامی طاقت کے مراکز مضبوط ہوں، وہاں طبقاتی بنیادوں پر منظّم تحریک کا پروان چڑھنا آسان نہیں ہوتا۔ طاقتور طبقات کے مفاد میں یہی تھا کہ ایسی تحریکیں یا تو تقسیم ہو جائیں یا انہیں اپنے اندر جذب کر لیا جائے۔

نوے کی دہائی کے بعد ایک اور تبدیلی سامنے آئی، جب بہت سے ترقی پسند کارکن این جی او کلچر کی طرف منتقل ہو گئے۔ اس سے ایک طرف سماجی مسائل پر تو کام جاری رہا، مگر دوسری طرف نظریاتی اور انقلابی سیاست کی وہ شدت اور تنظیمی طاقت کم ہوگئی جو پہلے موجود تھی۔ جدوجہد ایک حد تک پروجیکٹ بیسڈ سرگرمیوں میں تبدیل ہوگئی، جس سے گراس روٹ سیاست مزید کمزور پڑی۔

مختصراً، ترقی پسند تحریک کی تقسیم کسی ایک قوت کا نتیجہ نہیں تھی بلکہ کئی عوامل

کے باہمی اثر کا نتیجہ تھی۔ ریاستی دباؤ، عالمی سیاست، اندرونی نظریاتی اختلافات، قیادت کے ذاتی مفادات اور سماجی ڈھانچے۔ یہ سب مل کر اس تقسیم کا سبب بنے۔ اس کے ساتھ ایک بنیادی حقیقت یہ بھی ہے کہ جب کوئی تحریک اندر سے مضبوط اور منظّم نہ ہو تو بیرونی دباؤ اسے آسانی سے توڑ دیتا ہے۔

تاہم یہ کہانی یہیں ختم نہیں ہوتی۔ حالیہ برسوں میں ایک بار پھر نئی حرکت اور جزوی احیاء کے آثار بھی سامنے آئے ہیں۔ تعلیمی اداروں میں دوبارہ سیاسی سرگرمیوں کی جھلک دکھائی دے رہی ہے، جہاں نیشنل سٹوڈنٹس فیڈریشن کے مختلف دھڑے اور پروگریسو سٹوڈنٹس الائنس جیسے پلیٹ فارم نئی نسل تک اپنی بات پہنچانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اسی طرح بائیں بازو کی سیاست سے وابستہ مختلف گروپس بھی دوبارہ منظّم ہونے کی کوشش کر رہے ہیں، جو کسی نہ کسی شکل میں کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کی تاریخی روایت سے جڑے ہوئے ہیں، اور نئے ناموں اور شکلوں میں سامنے آ رہے ہیں۔

یہ نئی سرگرمی اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ ترقی پسند سیاست مکمل طور پر ختم نہیں ہوئی، بلکہ بدلتے حالات کے ساتھ نئی شکل اختیار کر رہی ہے۔ نوجوان نسل میں بڑھتی ہوئی معاشی بے یقینی، مہنگائی، بے روزگاری اور عدم مساوات جیسے مسائل ایک بار پھر سیاسی شعور کو جنم دے رہے ہیں۔ تاہم یہ احیاء ابھی ابتدائی مرحلے میں ہے اور اسے وہی پرانے چیلنجز درپیش ہیں مثلاً تنظیمی کمزوری، محدود دائرہ اثر، اور دوبارہ تقسیم کا خطرہ۔

اسی دوران عالمی سطح پر بھی معیشت کا تصور تبدیل ہو رہا ہے۔ چین، روس اور لاطینی امریکہ کے کچھ ممالک نے یہ دکھایا ہے کہ روایتی سوشلسٹ یا خالص سرمایہ دارانہ ماڈلز کے بجائے ایک درمیانی راستہ اختیار کیا جا سکتا ہے۔ اس نئے رجحان کو عمومی طور پر "ہیومن اکانومی" یا "انسان مرکوز معیشت" کہا جاتا ہے، جس میں انسان کو صرف محنت کش نہیں بلکہ ایک قیمتی سرمایہ سمجھا جاتا ہے۔

اس تصور کا بنیادی نکتہ یہ ہے کہ ریاست صرف روزگار فراہم کرنے کی ذمہ داری نہ اٹھائے بلکہ ایسے حالات پیدا کرے جہاں لوگ خود کو ہنرمند بنا کر اپنی معاشی حیثیت بہتر کر سکیں۔ تعلیم، صحت، ہنرمندی، اور چھوٹے کاروبار کی حوصلہ افزائی اس ماڈل کے اہم ستون ہیں۔ اس طرح لوگ ریاست پر بوجھ بننے کے بجائے معیشت کا فعال حصہ بنتے ہیں اور قومی ترقی میں کردار ادا کرتے ہیں۔

یہاں ترقی پسند سیاست کے لیے ایک نیا موقع پیدا ہوتا ہے۔ اگر یہ سیاست اپنے روایتی نعروں سے آگے بڑھ کر اس نئی "ہیومن اکانومی" کے ساتھ خود کو ہم آہنگ کرے تو وہ دوبارہ مؤثر بن سکتی ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ترقی پسند سیاست صرف حقوق کی بات نہ کرے بلکہ مواقع کی فراہمی کو بھی اپنی ترجیحات میں شامل کرے۔

ریاست کا کردار اس حوالے سے بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ تعلیم اور صحت کی فراہمی، سوشل سیکیورٹی، اور کم از کم اجرت جیسے اقدامات اس بات کو یقینی بناتے ہیں کہ ہر فرد کو زندگی میں آگے بڑھنے کا ایک منصفانہ موقع ملے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہنرمندی کی تربیت، ڈیجیٹل معیشت میں شمولیت، اور چھوٹے کاروبار کے لیے آسان مالی وسائل فراہم کرنا لوگوں کو خود کفیل بنانے میں مدد دیتا ہے۔

تاہم اس عمل میں ایک توازن بھی ضروری ہے۔ اگر ریاست مکمل طور پر پیچھے ہٹ جائے اور تمام ذمہ داری افراد پر ڈال دے تو عدم مساوات میں اضافہ ہو سکتا ہے۔ اسی لیے ترقی پسند سیاست کا ایک اہم کردار یہ بھی ہے کہ وہ مارکیٹ کو منظّم کرے، استحصال کو روکے، اور اس بات کو یقینی بنائے کہ معاشی ترقی کے فوائد سب تک پہنچیں۔

یوں کہا جا سکتا ہے کہ آج کے دور میں کامیاب ترقی پسند سیاست وہی ہوگی جو ایک مضبوط ریاست، بااختیار اور ہنرمند عوام، اور منصفانہ مارکیٹ کے درمیان توازن قائم کر سکے۔ یہ صرف نظریاتی بحث کا موضوع نہیں بلکہ ایک عملی چیلنج ہے جس کے لیے تنظیم سازی، پالیسی سازی، اور نئی قیادت کی ضرورت ہے۔

آخرکار، یہ پوری بحث ہمیں ایک اہم نتیجے تک لے جاتی ہے: نظریات اپنی جگہ اہم ہیں، مگر ان کی کامیابی کا انحصار اس بات پر ہے کہ وہ بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ کس حد تک خود کو ہم آہنگ کرتے ہیں۔ اگر ترقی پسند سیاست ماضی کی غلطیوں سے سیکھ کر ایک زیادہ متحد، عملی اور "انسان مرکوز" راستہ اختیار کرے تو وہ نہ صرف دوبارہ زندہ ہو سکتی ہے بلکہ ایک مؤثر اور مثبت قوت کے طور پر ابھر سکتی ہے۔

ن۔م راشد کی شاعری میں نوآبادیاتی نظام کے خلاف مزاحمتی رویے

ڈاکٹر امتل ضیاء (شعبہء اُردو، جامعہ شہید بینظیر بھٹو یونیورسٹی برائے خواتین، پشاور) ڈاکٹر شیر علی (الحمد یونیورسٹی اسلام آباد)

ن۔م راشد کی شاعری کا سفر رومانیت سے حقیقت نگاری کی طرف رواں دواں ملتا ہے۔ ہر رومانی شاعر کی طرح راشد بھی موجودہ نظام سے مطمئن نہیں تھے۔ وہ اس خاک دا کو حسن وخوبی گا کا گہوارہ بنانا چاہتا تھا مگر اُس کا خاک دا تو غلامی کا طوق پہنے ہوئے تھا۔ راشد کی شاعری کا ایک اہم حصہ مشرق کی غلامی پر نوحہ خوانی اور مغرب کی سامراجی عوامل کے بیان پر مبنی ہے۔ راشد کی شاعری مشرق اور مغرب کے سیاسی اور سماجی وتہذیبی ضد سے پیدا شدہ ذہنی وفکری تصادم کی بھرپور عکاسی کرتی ہے۔ راشد نے جس دور میں جنم لیا وہ ایک غلام ہندوستان کا دور تھا۔ جس میں ہر حکم، ہر اصول انگریز سامراج کا چلتا تھا، یعنی ہندوستان، تاجِ برطانیہ کے زیرِ اثر تھا اور آقا اپنے نوآبادیات کا استحصال اپنے مفاد اور ترقی کے لئے جاری وساری رکھے ہوئے تھا۔

نوآبادیات کے خلاف احساس شدت کے بیان سے پہلے اس اصطلاح کا مختصر تعارف یہاں ضروری سمجھتی ہوں۔ نوآبادیات میں سامراجی قوتیں دور دراز علاقوں میں بستیاں بساتے ہیں اور مقامی سیاسی کنٹرول کو اپنے ہاتھ میں رکھتی ہے۔ حکمرانِ ریاست، نوآبادی کے افراد کی خودمختاری، سیاسی آزادی سلب کر لیتی ہے۔ ان کا مقصد نوآبادیات کو اپنا مطیع بنانا ہوتا ہے اور سامراجی دولت میں اضافہ اور نوآبادیات کا معاشی وسیاسی استحصال ہوتا ہے۔ نوآبادیاتی نظام کے قیام کا اہم جواز نسلی اور تہذیبی برتری ہے۔ طاقتور اقوام کمزور اقوام کو طاقت کے بل بوتے پر اپنا غلام بنا لیتی ہے۔ سامراجی علم برداروں کے نزدیک مشرق جہالت میں گھرا ہوا پس ماندہ خطہ تھا۔ جہاں رہنے والے لوگ جو اس خطے کے باسی تھے سست، کاہل اور عقل و دانش سے دور تھے۔ جبکہ اہل مغرب، صاحبِ علم وفراست، تیز وتند اور سائنسی اور منفی سوچ رکھنے والے تھے۔ انہیں وجوہات کی بنا پر یہ بہتر تھا کہ وہ سامراج کے لئے ایک نوآبادی کی حیثیت سے رہے، تاکہ ترقی کی راہیں ان کے لئے ہموار ہوں۔ یہ ترقی اصل میں سامراج کی ہی ترقی تھی لیکن بظاہر وہ نوآبادیات کے مفاد کی بات کرتے تھے۔

نوآبادیاتی نظام ایک ایسا نظام ہے جس میں استعمار اپنی زبان، تہذیب اور معاشرت کو محکوم اقوام پر مسلط کراتے ہیں اور ایسی فضا تخلیق کرتے ہیں کہ محکوم اقوام یہ سمجھے کے یہ ان کی فلاح و بہبود کے لئے ضروری ہے۔ نوآبادیاتی نظام میں دونفسیاتی محرکات کا بنیادی کردار رہا ہے۔ ایک تو یورپ کا احساسِ تفاخر بحوالہ مذہب ہے جبکہ دوسرا نسلی برتری کا احساس۔ اور انہی کی بدولت وہ باقی تمام اقوام کو انسانی ارتقا کے حوالے سے دوسرے درجے کی مخلوق سمجھتے ہیں۔ ان خیالات کی بنیاد پر سامراج نے اپنی نوآبادیات کو مغلوب ومقصور قرار دیا۔

راشد کی شاعری میں مشرق کی زبوحالی، زوال پذیری اور بدحالی کا ذکر جہاں ملتا ہے وہاں اس کے اسباب کے طور پر اس کے ذہن میں سامراج اور نوآبادیاتی نظام قرار پاتے ہیں۔ وہ سامراج کے خلاف شدید ردِعمل پیش کرتے ہیں۔ اس کے خیال میں انگریز سامراج مشرق کی ذلت اور زبوں حالی کا محرک ہے، جس نے پورے مشرق پر اپنا تسلط قائم کر کہ انھیں ذلت اور بے بس زندگی گزارنے پر مجبور کیا۔ راشد کی شاعری کے آغاز سے لے کر ان کی تخلیقی عروج تک کے زمانے میں ہندوستان میں انگریز سامراج اور مقامی قوتوں کے درمیان کشمکش کا سلسلہ شدید تر ہو چکا تھا۔ سامراج کی معاشی غاصبانہ پالیسیوں اور سماجی وسیاسی لوٹ کھسوٹ کی پالیسیوں نے ہندوستان میں شدید سیاسی وسماجی اور اقتصادی بحرانوں کو جنم دیا۔ راشد نے مشرق کی پس ماندگی، بے بسی اور ذلت کا ایک سبب انگریز سامراج کے جبر واستبداد کو قرار دیا۔ اس کے ساتھ وہ مشرق کی پس ماندگی کا دوسرا سبب مشرق کی روایات جیسا کہ توہم پرستی، قدامت پسندیدی، تصوف، درویشی وغیرہ کو سمجھتے تھے۔ اس لئے وہ سیاسی اور اقتصادی حوالوں سے مشرق کے زوال کے لئے انگریز سامراج کو قصوروار قرار دیتے تھے۔ راشد نے ہندوستان کے آئینے میں پورے مشرقی ممالک کو دیکھا اور ان کی زبوں حالی کے لئے مغرب کی استحصال پسند فطرت اور ستم پروری کو سمجھا۔ ان کے اولین مجموعہ کلام "ماورا" میں یہ احساس ارتقائی مراحل طے کرتے ہوئے آگے بڑھتا ہے کہ ہندوستان غلامی کے پنجے سے نکلنے کے لئے کوشاں ہے۔ ڈاکٹر محمد فخر الحق نوری، راشد ہی کی زبانی ایک حوالہ دیتے ہیں۔

"جس زمانے میں مَیں نے پرورش پائی ہندوستان اجنبی حکومت کے پنجوں سے

نکلنے کے لئے جدوجہد کر رہا تھا۔شروع ہی سے میرے نزدیک اس آزادی کی جدوجہد فرد کی آزادی تھی کیونکہ غلامی نے فرد کی اخلاقی اور نفسیاتی زندگی میں ایک خلاء پیدا کر رکھا تھا۔۔۔۔غلامی درہم برہم کر کے رکھ دیتی ہے۔"(1)

"ماورا" کی نظموں میں ن۔م راشد نے ایک ایسی فضا کا بیان کیا ہے جس میں فرد دو دنیاوں میں معلق تھا۔اس کے مسائل اپنے وطن میں ایک مخصوص فضا کی پیداوار تھے اور یہ فضا غلامی میں جکڑے ہوئے افراد کی خستہ حالی کی عکاس تھی۔اس خستہ حالی میں ایک عنصر اگر سامراج کا ظلم وستم تھا،تو دوسرا مشرق کے لوگوں کا وہ عقیدہ جس کی بنیاد پر وہ تمام افعال وواقعات کے ظہور کی وجہ،خدا کی مرضی کو قرار دیتے ہیں۔ن۔م راشد نے مغرب کی مخالفت میں مشرق کی نجات کی راہ تلاش کرنے کی سعی کی۔راشد کو تہذیبی یا مذہبی لحاظ سے مغرب سے کوئی تضاد نہیں تھا بلکہ سیاسی طور پر غلامی کی مخالفت اس نے بھرپور کی۔نظم "شاعرِ درماندہ" میں وہ اپنے خیالات کا اظہار کچھ یوں کرتے ہیں۔

زندگی تیرے لئے بسترِ سنجاب وسمور
اور میرے لئے افرنگ کی دریوزہ گری
عافیت کوشئ آبا کے طفیل،
میں ہوں درماندہ وبے چارہ ادیب
خستہ ءفکرِ معاش!
پارہ نانِ جویں کے لئے محتاج ہیں ہم
(2) میں،مرے دوست،مرے سینکڑوں اربابِ وطن

ن۔م راشد نے اس نظم میں مشرق کے زوال کی وجہ ان کی بےعملی اور پرانی روایات سے وابستگی کو قرار دیا۔ان کے خیال میں اس ظلم سے نجات کا ذریعہ نئی سوچ اور بصیرت پیدا کرنے سے حاصل ہوسکتی ہے۔جبکہ معاشی استحصال کا سبب یہاں بھی مغرب کی اقتصادی اجارہ داری ہے جس نے راشد کے ہم وطنوں کو غربت اور افلاس میں مبتلا کیا ہوا تھا۔اس طرح "دریچے کے قریب" میں جن خامیوں کی طرف اشارہ کیا ہے،وہ بھی مشرق کے زوال کا سبب اور مغرب کے ظلم و جبر کی بنیاد ہے۔مذہب کا غیر متحرک اور جامد تصور بھی نوآبادیات کے لئے سامراج کے عفریت کو مستحکم کرنے کا سبب بنا۔اس لئے وہ مشرق کو اس سے نکالنے کا سوچتا ہے اور کہتا ہے۔

جاگ اے شمعِ شبستانِ وصال
محفلِ خواب کے اس فرشِ طربناک سے جاگ!
لذّتِ شب سے میرا جسم ابھی چور سہی
آ مری جان،مرے پاس دریچے کے قریب
دیکھ کس پیار سے انوارِ سحر چومتے ہیں
مسجدِ شہر کے میناروں کو
جن کی رفعت سے مجھے

(3) اپنی برسوں کی تمنّا کا خیال آتا ہے!

آزادی اور عروج کی تمنا ہر اس دل میں جنم لیتی ہے جو موجود کی غلامی سے بیزار ہوتا ہے۔راشد بھی اسی برسوں پرانی تمنا کے حصول کے لئے بےقرار ہے،جو اس سے اور اس کے ہم وطنوں سے انگریز سامراج نے چھین لی تھی۔برسوں کی تمنا مسلمانوں کی آزادی اور اسلام کی حیات نو کی تمنا ہے۔اس نظم میں شاعر دیارِ افرنگ کے ایک انبوہ کی جانب اشارہ کرتا ہے کہ بیمار بھی ہے،مفلس بھی ہے،کمزور بھی ہے مگر ظلم سہے جاتے ہیں۔

دیکھ بازار میں لوگوں کا ہجوم
بے پناہ سیل کے مانند رواں!
جیسے جنّات بیابانوں میں
ان میں مفلس بھی ہیں بیمار بھی ہیں

(4) زیرِ افلاک مگر ظلم سہے جاتے ہیں۔

راشد نے اپنی نظم میں مشرق اور مغرب میں پائی جانے والی رنگ ونسل کی اویزش کو بھی پیش کیا۔رنگ ونسل کی برتری بھی نوآبادیات کی تخلیق اور سامراج کی احساسِ برتری کا ایک اہم سبب رہا ہے۔ماورا کی نظم "اجنبی عورت" میں راشد نے اسی رویے کو پیش کیا ہے،جو مزاحمت کا ایک حوالہ ہے۔راشد نے دیوارِ ظلم اور دیوارِ رنگ کی علامتوں کے ذریعے انگریزوں کے نسلی امتیاز کے احساس اور ظلم وستم کو بیان کیا ہے۔

ایشیا کے ذورافتادہ شبستانوں میں بھی
میرے خوابوں کا کوئی رومان نہیں!
کاش اِک دیوارِ ظلم
میرے ان کے درمیاں حائل نہ ہو!
یہ عماراتِ قدیم
یہ خیاباں،یہ چمن،یہ لالہ زار،
چاندنی میں نوحہ خواں
اجنبی کے دستِ غارتگر سے ہیں

ارضِ مشرق، ایک مبہم خوف سے لرزاں ہوں میں
آج ہم کو جن تمناؤں کی حرمت کے سبب
(5) دشمنوں کا سامنا مغرب کے میدانوں میں ہے

راشد کی ابتدائی شاعری سے لے کر آنے والے ارتقائی مراحل میں ایک تسلسل کے ساتھ غیروں کے تسلط سے آزادی کی کوشش مختلف صورتوں میں نظر آتی ہے۔ جس میں نظام کے خلاف مزاحمت، اجنبی عورت کے جسم سے انتقام کی ایک شکست خوردہ صورت میں بھی دکھائی دیتی ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے راشد کی شاعری کو نئے انداز کی شاعری قرار دیا ہے۔ نظم میں فضا فرنگی شبستاں کو پیش کر رہی ہے مگر بہ باطن انتقام لینے کا جذبہ موجود ہے۔ ڈاکٹر آفتاب احمد ان کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"راشد کے ہاں گرد و پیش کے معاشرتی اور سیاسی حالات کا نہایت گہرا اور شدید احساس ملتا ہے۔ لیکن ان حقائق کا ایک تاریخی پس منظر بھی ہے۔ ماضی و حال ایک تسلسل کا نام ہے چنانچہ ماضی کا احساس بھی راشد کے شعور کا ایک حصہ ہے۔ کبھی وہ عافیت کوشی آبا کی یاد بن کر ابھرتا ہے (شاعرِ درماندہ) اور کبھی وہ تین سو سال کی ذلت کا نشان۔۔۔۔۔ ایک ملائے حزیں کی شکل میں نظر آتا ہے۔ (دریچے کے قریب) "ایران میں اجنبی" کی نظموں میں یہ احساس زیادہ نمایاں ہے

(6) فرنگ کی شام جاں ستاں تک پھیلا ہوا یہ درد لا دوا مختلف عنوانات سے ظاہر ہوا ہے۔

"ایران میں اجنبی" کی نظموں میں راشد کا سیاسی شعور اور معاصر عالمی صورتِ حال کی عکاسی بھرپور انداز میں کی گئی ہے۔ اس مجموعہ کلام میں عالمی استعمار کے خلاف فکری لے زیادہ تیز اور بلند ہو کر سامنے آتی ہے۔ نظم "تیل کے سوداگر" میں استعماری صورتِ حال کے خلاف بھرپور مزاحمت ملتی ہے۔

تیل کے بوڑھے سوداگروں کے لبادے پہن کر۔
وہ کل رات یا آج کی رات کی تیرگی میں،
چلیں آئیں گے بن کے مہماں
تمھارے گھروں میں،
وہ دعوت کی شب جام و مینا لنڈھائیں گے
ناچیں گے، گائیں گے،
بے ساختہ قہقہوں، ہمہموں سے
وہ گرمائیں گے خون محفل!
مگر پو پھٹے گی
تو پلکوں سے کھودو گے تم اپنے مُردوں کی قبریں
بساطِ ضیافت کی خاکسترِ سوختہ کے کنارے
(7) بہاؤ گے آنسو!

نظم "زنجیر" میں راشد برطانوی سامراج کے خلاف صدائے بغاوت بلند کرتے ہیں۔ وہ سیاسی بیداری کے ذریعے عوام کو بغاوت اور احتجاج کی راہ پر ڈال کر غلامی کی زنجیریں کاٹ ڈالنے کا درس دیتے ہیں اور کہتے ہیں۔

ظلم پروردہ غلامو! بھاگ جاو
پردہ شب گیر میں اپنے سلاسل توڑ کر،
چار سُو چھائے ہوئے ظلمات کو اب چیر جاو
اور اس ہنگامِ باد آورد کو
(8) حیاءِ شب خون بناو!

"ایران میں اجنبی" کی شروع کی نظموں میں ایران کی صورت حال بیان کی گئی ہے، جب امریکہ، روس اور برطانیہ کی افواج ایران کے شمال جنوب اور مغرب کی طرف بیک وقت داخل ہوئی۔ راشد چونکہ ہندوستانی دستے کے ساتھ ایران گیا تھا، وہاں یہ احساس کہ وہ جنگ آزادی کا سرفروش سپاہی نہیں بلکہ سامراج کا ایک ادنیٰ غلام بن کر لڑ رہا ہے۔ اس طرح راشد کے ہاں جنگ دو محاذوں پر لڑی جا رہی تھی ایک سامراج کے خلاف اور ایک اپنی ذات کے خلاف۔ یہ کشمکش ان کی شاعری میں آخر تک نظر آتی ہے، لیکن سامراج کے خلاف مزاحمت کے رویے پاکستان بننے کے بعد ایک نئی صورت اختیار کر لیتی ہے جو "سبا ویراں" میں ایک الگ دائرے کے گرد گھومتے ہیں۔ یہاں پر راشد اُن اربابِ سبت و کشاد کو طنز کا نشانہ بناتے ہیں جو بظاہر تو اسی دیس سے تعلق رکھتے ہیں، مگر غیر ملکی آقاوں کے اشاروں پر عمل پیرا ہو کر اس غلامی کے طوق کو ایک نئی صورت عطا کئے ہوئے ہیں۔

جب انسان ظلم سہتا ہے تو ظالم کو اپنا حق سمجھ کر کرتا ہے، مگر جب وہ اس کے خلاف مزاحمت کرتا ہے تو آزادی کی راہیں ہموار ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔ ن م راشد نے اپنی شاعری میں مشرق و مغرب کے سیاسی اور تہذیبی تصادم کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ راشد کا دور مشرق میں سیاسی بیداری کا دور تھا۔ راشد اپنی شاعری میں اندرونی و بیرونی استبداد کے خلاف جنگ لڑتا دکھائی دیتا ہے۔ وہ علامتوں کے ذریعے انگریز استعمار کو مشرق کی غلامی کا قصوروار قرار دیتا ہے۔ راشد کے حوالے سے ڈاکٹر تبسم کچھ یوں رقم طراز ہوتے

ہیں۔

"راشد کا زمانہ رہ ہے جب نوآبادیاتی نظام کے خلاف نفرت کا ردِعمل پیدا ہو چکا تھا اور نوجوان اس کے خلاف جدوجہد کرنے لگے تھے۔ راشد کے پہلے دو مجموعوں کو کردار یہ تھا (9) کہ ان کی نظمیں ایک نفسیاتی، جذباتی اور سیاسی ردِعمل کا اظہار تھیں

راشد کی نظم میں استبداد کے خلاف احتجاج ہمیں مختلف استعاروں، علامتوں میں ملتا ہے جو اس غلامی، بے بسی اور سامراجی جبر کو بیان کرتے ہیں جس کا سامنا اس دور کے فرد کو تھا۔ ضیاالحسن اس حوالے سے لکھتے ہیں۔

"راشد نے سیاسی موضوعات کو کہیں جنسی تلازمات کے ذریعے اور کہیں داستانوں اور تاریخی کرداروں اور واقعات کو علامت بنا کر پیش کیا ہے۔ راشد جس دور میں شاعری کر رہے تھے وہ برصغیر کی غلامی کا آخری دور تھا۔ انگریز سامراج کے خلاف آزادی کی تحریکیں چل رہی تھیں لیکن ابھی آزادی کی منزل بہت دور تھی۔ ہر طرف پھیلی ہوئی غربت اور جہالت نے زندگی کو بے بس اور ناتواں کر دیا تھا۔ اگرچہ کی ابتدائی نظمیں رومانی انداز کی ہیں لیکن اس کے باوجود ان میں سیاسی بے بسی کی تصویریں نظر آتی ہیں۔ وہ انسان کی اس ذلت اور بربادی پر نوحہ خواں نظر آتے ہیں۔

الٰہی تیری دنیا جس میں ہم انسان رہتے ہیں
غریبوں جاہلوں مردوں کی بیماروں کی دنیا ہے
یہ دنیا بے کسوں کی اور لاچاروں کی دنیا ہے
ہم اپنی بے بسی پر رات دن حیران رہتے ہیں
ہماری زندگی اک داستاں ہے ناتوانی کی
(انسان)

اس بے بس اور لاچاری میں اس وقت اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے کہ وہ سب چیزیں جن پر اب ایک اجنبی قوم کو تصرف حاصل ہے کبھی ہماری ملکیت تھیں۔

میں اکثر چیخ اٹھتا ہوں بنی آدم کی ذلت پر
جنوں سا ہو گیا ہے مجھ کو احساس بضاعت پر
ہماری بھی نہیں افسوس جو چیزیں "ہماری" ہیں
(10)(انسان)

راشد انسانی آزادی کا حامی ہے۔ اسے اس بات کا اندازہ ہے کہ انسانی آزادی کے دشمن نہ صرف اس کے منفی رومانی فلسفے ہیں بلکہ ماضی کے جابر اور آمر بادشاہ اور سامراجی لٹیرے بھی اس کے آزادی کے قاتل ہیں۔ راشد مشرق کی رومانیت سے بیزار ہے اور اس کے مادی افلاس اور معاشرتی انحطاط کا حل تلاش کرنا چاہتا ہے۔ اس لئے اس تہذیبی انحطاط کے اسباب میں سامراج بھی ایک وجہ قرار پاتی ہے اور وہ اس کے خلاف مزاحمت کرتے ہیں۔ اس حوالے سے وارث علوی لکھتے ہیں۔

"راشد کی شاعری مشرق و مغرب کے سیاسی اور تہذیبی تصادم سے پیدا شدہ فکری اور جذباتی پیچیدگیوں کی پوری شدت سے عکاسی کرتی ہے۔ راشد کی شاعری میں جو مشرق ابھرتا ہے وہ سیاسی بیداری کا مشرق ہے۔"

(11) یہی سیاسی بیداری مشرق کے فرد میں نوآبادیات کے خلاف مزاحمت کا رویہ پیدا کرتا ہے۔ جس کا اظہار راشد نے اپنی شاعری میں کہیں علامت کے ذریعے کیا ہے اور کہیں کھلے الفاظ میں۔ اور اسی طرح تہذیبی، معاشرتی اور معاشی رویوں کو مختلف کرداروں کی صورت میں اجاگر کیا۔ خود اپنی ذات میں موجود غلامی کی خصلتوں کو بھی وہ بے دھڑک پیش کر دیتے ہیں۔ اس حوالے سے ڈاکٹر ثمینہ شکیل لکھتی ہیں۔

"راشد اپنی شاعری میں اندرونی اور بیرونی استبداد کے کے مدِ مقابل جنگ کرتا دکھائی دیتا ہے۔ اپنی نظم "سپاہی" میں اپنے وطن کے دفاع کے لئے تشویش بھی کرتا ہے۔

تو مرے ساتھ کہاں جائے گی؟
موت کا لمحہ مایوس نہیں
قوم ابھی نیند میں ہے!
مصلح قوم نہیں ہوں کہ میں آہستہ چلوں
اور ڈروں قوم کہیں جاگ نہ جائے
میں تو اک عام سپاہی ہوں مجھے
حکم ہے دوڑ کے منزل کے قدم لینے کا
اور اسی سعیِ جگر دوز میں جاں دینے کا
تو مرے ساتھ مری جان، کہاں جائے گی؟
عمر گذری ہے غلامی میں مری
اس اب تک مری پرواز میں کوتاہی ہے!

(12) ن۔م راشد نے نوآبادیاتی نظام کے خلاف مزاحمت کا جو رویہ "ماورا" میں پیش کیا تھا، "ایران میں اجنبی" میں وہ مزید وسیع ہو گیا۔ اس کتاب کی نظموں میں ایشیاء کی بدحالی کا نقشہ مرتب کرتے ہوئے، مشرق کی خامیوں کے بیان کے ساتھ ساتھ استعمار کی چیرہ دستیوں کو بھی بے نقاب کیا ہے۔ یوں وہ نوآبادیاتی نظام کے خلاف بھرپور آواز بن کر ابھرتے ہیں

پاکستان میں بائیں بازو کا احیاء

صباالدین صبا

☆.....☆

ماضی میں فرسودہ در بند اور دم چھلا پن پر مبنی پالیسیوں کے باعث انقلابی پارٹی کے حصول میں ناکامی کے نتیجے میں بائیں بازو کے کارکن مایوس، تنہائی اور احساس شکست کا شکار ہوگئے تاہم تیزی سے بدلتی ہوئی دنیا، عالمی سرمایہ دارانہ نظام کی ناکامیوں اور عالمی وعلاقائی سطح پر ہونے والی مثبت تبدیلیوں نے پاکستان میں بھی بائیں بازو کے کارکنوں میں تجدید کی امنگ پیدا کی ہے یہ بات خوش آئند ہے کہ آج بائیں بازو کے ساتھی پارٹی بلڈنگ، مخصوص معاشرے میں کیڈر کی تعمیر، وسائل کی اہمیت او رحصول کے ذرائع، کارکنوں او ررہنماؤں کی نظری سطح پر ترقی جیسے اہم اور حساس موضوعات پر بحث کرنے میں دلچسپی لے رہے ہیں۔

جنوبی ایشیا کی انقلابی جماعتوں کے اجتماع میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ جہاں پارٹی نہیں ہے وہاں پارٹی بنائی جائے، جہاں پارٹی موجود ہے اسے فعال بنایا جائے اور جہاں صورت حال موزوں ہو وہاں انقلابی عمل کا آغاز کیا جائے ہم پاکستان میں آج بھی پہلے مرحلے میں ہیں اور ہماری تمام تر توجہ ایک حقیقی انقلابی پارٹی تشکیل دینے پر مرکوز ہونی چاہیے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے ضروری ہے کہ ماضی کی غلطیوں کا تعین کیا جائے اوران کی اصلاح کی جائے

برصغیر پاک و ہند میں انقلابی سفر کا آغاز کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا ((CPI) سے ہوالیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ سی پی آئی نو آبادیاتی اور جاگیر دارانہ نظام کے خلاف جدوجہد کی قیادت کرنے میں ناکام رہی یہاں تک کہ اس کی پالیسیوں کو ساتھ لے کر چلنے والا بائیں بازو کا بھارت پاکستان یہاں تک کہ بنگلہ دیش میں بھی ناکام رہا۔ بھارت میں تفرقہ پسندی، پاکستان میں پارٹی بنانے میں ناکامی اور بنگلہ دیش میں طاقت ور انقلابی تنظیم کی تحلیل کی بہت سی وجوہات ہوسکتی ہیں لیکن بعض مشترکہ خامیوں کی نشاندہی ضروری ہے۔ بنگلہ دیش میں حسینہ واجد حکومت کے خلاف چلنے والی تحریک اور سیاست سے بائیں بازو کے غالب ہوجانے کے بعد ڈھاکہ یونیورسٹی میں ایک سروے کیا گیا جس کا مقصد یہ تھا کہ 70 کی دہائی تک بائیں بازو کا گڑھ جانی جانے والی یونیورسٹی سے بائیں بازو کی قیادت یکسر غائب کیوں کر ہوگئی۔ اس سروے کی رپورٹ پر مبنی ایک مضمون بنگلہ دیشی اخبارات میں شائع ہوا جس کا عنوان تھا (Alteism and election) مضمون میں خیال ظاہر کیا گیا کہ انہی دو وجوہات کی بنا پر بائیں بازو کی قیادت طلبا و طالبات سے دور ہوتی چلی گئی۔ پورے خطے میں تحریک کا جائزہ لیا جائے تو دو اہم ترین کمزوریاں سامنے آتی ہیں۔ پہلی کمزوری طبقاتی لائن سے دوری اور دوسری بڑی خامی مقامی کلچر، عقائد اور اقدار سے لاتعلقی۔ تلنگانہ تحریک سے نکسل باڑی تحریک تک ہر تحریک کو طبقاتی عینک سے دیکھنے کے بجائے سطحی مظاہر اور بورژوا سیاسی مصلحتوں کی نذر کر دیا گیا۔ دونوں اہم مواقع پر کمیونسٹ پارٹی میں دھڑے بندی اس بنیادی خامی کا مظہر ہے۔

پہلی آزاد ہند حکومت 1915 بہ مقام کابل کے وزیر اعظم مولوی برکت اللہ بھوپالی سے لے کر دوسری آزاد ہند حکومت 1943 بہ مقام سنگاپور کے سربراہ سوبھاش چندر دیوس تک برطانوی سامراج سے آزادی اور فرسودہ جاگیر دارانہ نظام کے خلاف لڑنے والے ہیروز کو نظر انداز کرتے ہوئے برصغیر کے بائیں بازو کے اپنے رشتے بورژوا پارٹیوں سے استوار کیے

مغرب زدہ دانشوروں کے پاس طبقاتی لائن کبھی واضح نہیں رہی پہلی بڑی کسان تحریک، تلنگانہ کے مسئلے پر سی پی آئی دو دھڑوں میں تقسیم ہوگئی اسی طرح نکسل باڑی کسان تحریک شروع ہوئی تو پھر سی پی آئی ایم میں تقسیم ہوگئی۔ طبقاتی لائن کی ناپیدی نے بائیں بازو کو معاشرے کے ٹھوس حقائق سے دور رکھا مغرب سے متاثرہ دانشوروں نے مقامی عقائد، روایات اور اقدار سے دوری اختیار کی اور انقلاب کی مقام صفات سے بے بہرہ رہے۔ برطانیہ کے جانے کے بعد بھارت اور پاکستان اور بنگلہ دیش کے نام نہاد انقلابی ایلیٹ ازم اور اتھی ازم کا شکار رہے اور اپنے عوام سے دور ہوتے چلے گئے جس کے نتائج ان تینوں ملکوں کی سیاست میں آج دیکھے جاسکتے ہیں۔

مذکورہ تینوں ممالک میں اشرافیہ کی حکمرانی ہے عوام موجودہ سماجی اقتصادی نظام، سامراجی تسلط سے نفرت کرتے ہیں لیکن کسی منظم انقلابی جدوجہد کے لیے مقامی صفات کو مدنظر رکھتے ہوئے پروگرام اور حکمت عملی کو وضع کرنے کی ضرورت آج بھی موجود ہے۔

پاکستان میں بائیں بازو کی تاریخ کا آغاز کمیونسٹ پارٹی آف

انڈیا(CPI) سے ہوتا ہے بلکہ یہ بھی ایک اہم حقیقت ہے کہ کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کی تشکیل بھی سی پی آئی کے کلکتہ کے اجلاس میں ہوئی اور پاکستان میں پارٹی کا سربراہ بھی سی پی آئی نے ہی ''تعینات'' کیا تھا۔

طبقاتی لائن کی ناپیدی نے تمام معاملات کو طبقاتی جدوجہد اور عملی حقائق کے بجائے محض نظری بنیادوں پر دیکھنے کی روایت عام کی کسی بھی سیاسی تحریک کو طبقاتی عینک کے بجائے سطحی مظاہر اور بورژوا سیاسی مصلحتوں کی نذر کر دیا گیا۔ پاکستان میں ریاست کا سوال ہو، جمہوریت کا مسئلہ ہو، قومی سوال ہو یا عورت کا مسئلہ ہو ہر مسئلے کو طبقاتی تقسیم سے بالاتر ہو کر دیکھنے روایت عام ہوئی۔

جدید چین کے بانی اور علمی پرولتاریہ کے استاد چیرمین ماؤ کا کہنا ہے کہ

"In a class sosiety every our lives as a member of perticular class and every kind of thinking without excption is stempad with the brand of a class"

چیئرمین ماؤ کی اس واضح تعلیم کے بعد طبقاتی لائن کے حوالے سے کسی غلط فہمی کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

پروفیسر حاجی فیض کی اس رائے سے انکار ممکن نہیں کہ ہمارے خطہ اور خاص طور پر پاکستان میں بائیں بازو کے لیے لازم ہے کہ وہ آج کے مرحلے، سیاسی حیثیت، اور اپنے سماجی ڈھانچے کو اچھی طرح سمجھے اور سراہتے ہوئے بھی آگے بڑھے ان کی اپنی زبان میں

"Ourlastdesperately needsathorough understaning ofwho stand today in terms of our politicaleconomyand social structures we lack acomprehensive analysis ofthesituation andasresult to not possess a local narative to support the working class and struggling peoplesin our counties and acsoss the region.

سماجی انصاف کے حصول اور سوشلزم کی تعمیر میں: مقامی خصوصیات کی کلیدی اہمیت چینی انقلاب اور تعمیری کامیابیوں سے مسلمہ حیثیت اختیار کر چکی ہے۔

چینی تجربے کی کامیابی کا اس حقیقت سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ 1917 کے اولین لیننی انقلاب کی ہراول روسی کمیونسٹ پارٹی کے موجودہ اول سیکریٹری گیا ڈی زیا گنوف(Geuady Zyagauov) نے اپنے ایک حالیہ بیان میں کہا ہے کہ ہمیں چینی پارٹی کے کامیاب تجربے سے سیکھنا چاہیے اور ہے روسی سوشلزم کی تعمیر کرنی چاہئیے

"Weshouldlearnfromchinese Succesful example andbuildRusiansocialism, If we have lerning the succesful experiance from chinies ,thesovietUnion would not have dissolved.

طبقاتی لائن کو نظر انداز کرنے کے باعث ہم طبقاتی جدوجہد کی کلیدی اہمیت کو سراہنے اور اختیار کرنے میں کامیاب نہیں رہے بین الاقوامی، علاقائی اور مقامی حالات انقلابی تبدیلی کے متقاضی تھے لیکن یہ ایک مسلم اصول ہے کہ ریاست کی قلب ماہیت اور بنیادی نوعیت کی سماجی اقتصادی تبدیلی کے لیے لیننی طرز کی سیاسی جماعت کی ضرورت آج بھی ہے مغرب سے متاثر دانشوروں کی تعلیم کے نتیجے میں ہم اپنی تہذیب، عوام کی نفسیاتی کیفیت اور خود اپنی تاریخ سے غیر متعلق ہو کر رہ گئے قومی تاریخ کے ہیروز کے بجائے بورژواری شخصیات کے دامن سے بندھے رہے مولانا حسرت موہانی سے مولانا عبدالحمید خان بھاشانی تک ہم نے سب کو بھلا دیا

آج کی اپنی درسگاہوں اور اپنی صفوں کو ازسرنو منظم کرنے کے لیے سختی سے طبقاتی لائن اختیار کرنی پڑے گی اور اپنی جدوجہد میں مقامی صفات کو اجاگر کرنا ہوگا اس مقصد کے لیے عوامی لائن تھیوری(Mass line theory) سے رجوع کرنا ضروری ہے عوامی لائن تھیوری کا بنیادی سبق یہ ہے کہ ہمیں اپنے عوام پر مکمل اعتماد ہونا چاہیے۔ اس بات کو بہرصورت یقینی بنانا ضروری ہے کہ کوئی بھی ساتھی خواہ کسی بھی پوزیشن میں ہو عوام سے براہ راست رابطے میں رہے۔ اور ان کے ساتھ برابری کی سطح پر رشتہ استوار کرے اور کسی صورت میں بھی ان پر برتری جتانے کی کوشش نہ کرے۔ چینی کمیونسٹ پارٹی کے سیکریٹری جنرل صدر ژی جن پنگ کے مطابق ''ہم کہیں بھی پہنچ جائیں عوام کے سامنے ہماری حیثیت شاگرد کی ہوتی ہے''

آج نہ صرف پاکستان بلکہ خطے اور پوری دنیا ہنگامہ خیز صورت حال سے دوچار ہے اور کسی بھی ملک میں سیاسی عمل کو آگے بڑھانے کے لیے بین الاقوامی علاقائی اور مقامی تضادات کو سمجھنے اور سائنسی انداز میں ان کا حل تلاش کرنے کی ضرورت ہے☆☆

پارٹی کی تنظیم سازی کا پہلا پڑاؤ

تحریر: انجینئر حیدر زمان اخوندزادہ (صدر عوامی ورکرز پارٹی خیبر پختونخواہ)

انسانی معاشرے میں ہر دور کے تقاضے بدلتے رہتے ہیں ذہین لیڈر شپ زمانے کے ان تقاضوں کو پہچان لیتی ہے اور ان تقاضوں کو اپنے احداف کے حصول کے لئے استعمال کرتی ہے اسی طرح ہم تاریخ سے کچھ سبق حاصل کرتے ہیں اور چیدہ چیدہ اصول اخذ کر کے ان سے راہنمائی حاصل کر سکتے ہیں رومی غلاموں کی بغاوت جن کا لیڈر اسپارٹیکس تھا اور قدیم ایرانی کسانوں کی بغاوت دراصل استحصال اور ظلم کی انتہاء کا نتیجہ تھا پیرس کمیوں کے انقلاب کی وجوہات میں بھی جاگیردارانہ ظلم و جبر اور استحصال کارفرما تھا لیکن اس دوران سیاسی شعور بھی عوام میں سرایت کر چکا تھا برطانیہ میں خصوصی اور دیگر یورپی ممالک میں عمومی طور پر صنعتی انقلابات عادی حالات مقداری اور معیاری تبدیلیوں اور مزدور طبقے کی سوچ میں تبدیلیوں کا باعث ہے اور کارل مارکس کے نظریہ قدر ذائد نے ان تبدیلیوں کو سائینسی و معاشی بنیادیں فراہم کیں۔

بیسویں صدی کے آغاز نے یورپ کے نوآبادیاتی سامراجی ملکوں کے مابین کالونیوں کی تقسیم پر (1914-1918) پہلی عالمی جنگ چھیڑ دی اس جنگ میں اگرچہ زار روس شامل ہوا لیکن روس کی صنعتی معیشت اس قابل نہ تھی کی عالمی جنگ کے تقاضوں کو پورا کر سکتی کیونکہ روس کی معیشت عمومی طور پر جاگیردارنہ تھی البتہ روس کا پوری حصہ کچھ صنعتی پیداوار کر رہا تھا اور وہاں پر مزدور طبقہ ظہور پزیر ہو چکا تھا۔

ان حالات میں روس کے اندر انقلابی ادب اور سیاسی شعور پروان چڑھا اپنے میں ٹریڈ یونین تحریک بھی صنعتی شہروں میں پھیل چکی تھی اور ان تحریکوں میں سیاسی پارٹیوں کے کارکن بھی شریک ہوئے خصوصی طور پر روسی سوشل ڈیموکریٹک پارٹی اس پارٹی کے اندر بائیں بازو کے کارکنان نے بعد میں بالشویک پارٹی کا نام اختیار کیا اور جن کے نمایاں راہنماؤں میں وی آئی لینن اور جوزف اسٹالن کے نام قابل ذکر ہیں جو مارکسزم کے نظریے سے لیس تھے بالشویک پارٹی نے صنعتی مزدوروں جن کو عموماً پرولتاریہ کہا جاتا تھا نے 1917 کے اکتوبر کے مہینے میں سینٹ پیٹرز برگ اور ماسکو میں زار شاہی ایوانوں پر قبضہ کیا اور حکومت اپنے ہاتھ میں لی۔ اگرچہ سامراجی ممالک نے 14 اطراف سے سوویت یونین کے نوزائیدہ انقلاب پر حملہ کر کے خانہ جنگی کا آغاز کیا۔ لیکن بالشویک پارٹی اور مزدوروں کی بے پناہ قربانیوں کے سامنے سامراجی کامیاب نہ ہو سکے ایشیائی روس میں کسانوں نے بھی روسی مزدوروں کا ساتھ دیا لیکن 1917 کے انقلاب کی کامیابی کا سہرہ یورپی روس کے مزدوروں اور سپاہیوں کے سر ہے یعنی عمومی طور پر 1917 کا انقلاب مزدوروں نے برپا کیا جس میں بحریہ اور بری افواج کے سپاہیوں نے بھرپور ساتھ دیا۔ دوسری جنگ عظیم (1939-1945) میں مغربی ممالک کی کوشش تھی کہ نازی ہٹلر کے ذریعے سوویت یونین کا چراغ گل کر دیں لیکن روسی عوام کے دو کروڑ ستائیس لاکھ جانوں کی قربانی اور عظیم اسٹالن کے آہنی عزم نے ہٹلر کو شکست فاش دے کر سامراجی پلان پر پانی پھیر دیا۔ اب آتے ہیں چین کے تجربہ کی طرف..... چین کے اندر اگرچہ کیمونسٹ پارٹی کا قیام تو بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں عمل میں آیا لیکن چین میں صنعتی مزدوروں کی تعداد اس دور میں بہت کم تھی البتہ ملک میں نوابوں اور جاگیرداروں کی زرعی ملکیت لاکھوں ایکڑ پر مشتمل تھی اور کسان زرعی غلام تھے یعنی زمین کی خرید و فرخت میں کسانوں اور اس کے بال بچوں کا انتقال بھی کیا جاتا تھا معاشرے کے اندر یہ ظلم و استحصال انتہاء پر تھا اور اس طرح تضاد بھی کسانوں نوابوں، جاگیرداروں کے درمیان انتہاء پر تھا۔

اس بیچ میں جاپانی نوآبادیاتی سامراج نے چین پر فوجی قوت کے ذریعے کچھ علاقوں اور صوبوں پر قبضہ کر لیا، چینی کیمونسٹ پارٹی جس کی قیادت ماؤزے تنگ اور چواین لائی کر رہے تھے۔ انھوں نے کسانوں کی جنگ کو گوریلا جنگ کی شکل دی اور ایک لانگ مارچ کر کے ایک طرف تو جاگیرداروں سے کسانوں کو آزادی دلاتے رہے اور دوسری طرف جاپان کی نوآبادیاتی افواج کے خلاف لڑتے رہے۔ اس عمل کے خلاف انہوں نے آزاد علاقے قائم کیے اور وہاں پر عوامی جمہوری طرز کی ریاستیں قائم کیں۔ اس دوران چینی کیمونسٹوں نے جاپانی سامراج کے خلاف امریکہ اور چین کے حکمران چیانگ کائی شیک کے ساتھ متحدہ محاذ بھی بنایا اور محاذ توڑنے کے بعد امریکہ اور چیانگ کے خلاف لڑتے بھی رہے تا آنکہ 1449 میں جاپان، امریکہ اور چیانگ کائی شیک کو شکست دے کر پورے چین کو آزاد کرا لیا اور وہاں عوامی جمہوری راج کا قیام عمل میں لایا اور امریکہ کی مدد سے چیانگ کائی شیک نے فرار ہو کر چین کے ایک جزیرے فارموسا یعنی تائیوان پر حکومت قائم کر لی یہ بات قابل ذکر ہے کہ سوویت یونین نے اسٹالن کی سربراہی میں چینی آزادی اور عوامی جمہوری نظام کے قیام میں بھرپور مدد کی آج کل کا چین ایک بڑا صنعتی ملک بن گیا ہے اور کسانوں کی تعداد کے مقابلے میں مزدوروں کی اکثریت ہے اور معاشی میدان میں دنیا کی صف اول کی ریاست مانا جاتا ہے جس کے انقلاب کے بارے میں اور وہاں پر عوامی جمہوریت کے بارے میں یہی کہنا چاہتا ہوں کہ ابتدائی طور پر کسان طبقے کی راہنمائی چینی کیمونسٹ پارٹی نے کی گوریلا جنگ کر کے آزاد علاقے قائم کئے ان آزاد علاقوں میں عوامی جمہوری نظام نافذ کیا اور رفتہ رفتہ سارے چین میں یہ نظام لاگو کیا عوامی جمہوریت سے سوشلسٹ نظام کی طرف چین کے سفیر کی الگ سے بات کریں گے اسی طرح شمالی ویت نام، شمالی کوریا اور مشرقی یورپی ممالک خصوصی طور پر یوگوسلاویا میں انقلاب کے بارے میں پھر کسی وقت بات ہوگی کیوبا کا انقلاب جو چی گویرا اور فیدل کاسترو کی قیادت میں برپا کیا گیا وہ اپنی نوعیت کا انوکھا انقلاب تھا جو

گوریلا جنگ کے ذریعے ایک جزیرے میں برپا کیا گیا اور جس کا امریکی سامراج کے حملہ سے بچاؤ سوویت یونین نے کیا اس پر بھی الگ سے بات ہوگی اسی طرح براعظم افریقہ کے اندر چھوٹے چھوٹے ممالک میں انقلابات پر الگ سے لکھا جائے گا۔ روس میں مزدوروں اور سپاہیوں کے ذریعے، چین میں کسانوں کے ذریعے ویت نام میں سامراج دشمن گوریلا جنگ کے ذریعے انقلابات کامیاب ہوئے.....

اب آتے ہیں ہندوستان اور وسطی امریکہ کے اندر انقلاب لانے کی کوششوں کی طرف

ہندوستان میں کیمونسٹ پارٹی کی طرف داغ بیل تو 1925 میں ڈالی گئی۔ دوسری جنگ عظیم سے قبل ہندوستان میں برطانوی نو آبادی سے آزادی کی تحریک چلی اس میں کیمونسٹ پیش پیش تھے۔ 1941 میں بمبئی کی بندرگاہ پر سیلرز کی بغاوت میں کیمونسٹ پیش پیش تھے اور اس پاداش میں ان کو بہت سزائیں بھی ہوئیں ہمارے خطے سے دادا امیر حیدر کو اس بغاوت کی پاداش میں سزا ہوئی تامل ناڈو، بہار، مغربی بنگال تلنگانہ اور دوسرے صوبوں میں کیمونسٹ پارٹی کی باقاعدہ تنظیم کاری کی گئی ہندوستان میں انڈین نیشنل کانگریس مسلم لیگ اور دوسری انتخابی سیاست میں حصہ لینے والی پارٹیوں کی طرح کیمونسٹ پارٹی نے بھی انتخابی سیاست کا سہارا لیا اگرچہ ساتھ ساتھ ٹریڈ یونین کی وساطت سے مزدور سیاست میں بھی حصہ لیا۔ لیکن کانگریس پارٹی نے پورے ہندوستان میں مزدوروں اور کسانوں کو انتخابی سیاست اور سوشل ڈیموکریسی کے چکر میں ڈالا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ عوام سرمایہ دارانہ انتخابی سیاست کے پیچھے دوڑتے رہے اور خالصتا طبقاتی سیاست سے کنارہ کش رہے

پاکستان میں کیمونسٹ پارٹی ہندوستان کی کیمونسٹ پارٹی کی ایکسٹینشن کے طور پر قائم ہوئی جنرل سیکریٹری کا تقرر بھی ہندوستان سے عمل میں آیا۔ 1951 میں پاکستان میں لیاقت علی خان کی حکومت کے دور میں جنرل اکبر اور فیض احمد فیض وغیرہ کی سرکردگی میں ایک کوشش کی گئی جو ناکام ہوئی اور کیمونسٹ پارٹی کو غیر قانونی ڈیکلیر کر دیا گیا۔ پارٹی کے جنرل سیکریٹری حسن ناصر کو روپوشی کے دوران گرفتار کر لیا گیا اور امریکی سامراج کی ایماء پر 1961 میں ایوب خان کی حکومت کے دور میں ان کو شاہی قلعے میں شہید کر دیا گیا الیکشن میں جنرل ایوب نے صدارتی طرز حکومت اختیار کیا، انتخابی کالج کی ہیئت تبدیل کی اور صدر کا 1962 انتخاب بنیادی جمہوریت کے ممبران کے دونوں سے طے پایا۔ 1964 میں صدارتی انتخابات میں جب جنرل ایوب نے دیکھا کہ فاطمہ جناح جیت رہی ہیں تو دھاندلی کے ذریعے خود کو صدر بنوا لیا عوام ملک کے اندر گرانی، اور افسر شاہی کی مسلسل ظالمانہ حکمرانی سے تنگ آ چکے تھے اور 1967-68 میں ملک میں ہنگامے اور شورش کا آغاز ہوا حکومت نے پہلے تو اسے طاقت سے دبانے کی کوشش کی لیکن جب دیکھا کہ کوئی حربہ کامیاب نہیں ہو رہا تو ایوب خان نے مارشل لاء لگا کر حکومت جنرل یحییٰ خان کے حوالے کر دی۔ یحییٰ نے ایک آدمی ایک ووٹ کی بنیاد پر ملک میں پہلے عام انتخابات کروائے اس کا خیال تھا کہ وہ دھاندلی کر کے مطلوبہ نتائج حاصل کر لے گا لیکن یہ اس کی خام خیالی ثابت ہوئی اگرچہ 1970 کے الیکشن میں کچھ علاقوں میں دھاندلی بھی ہوئی

ان تاریخی حوالوں سے میرا مطلب کچھ اصولوں کا اخذ کرتا ہے

کیا پاکستان میں کسان تھریک کے ذریعے انقلاب لایا جا سکتا ہے

کیا پاکستان میں صنعتی مزدوروں کے ذریعے انقلاب لایا جائے گا

کیا پاکستان میں قومی آزادی سامراج سے آزادی انقلاب کا سبب بنے گی

میری رائے میں پاکستان کی تاریخ بتا رہی ہے کہ اس ملک میں تبدیلی کا عمل شہروں میں ادنی درمیانی طبقے کی شورش جس کے ساتھ دیہاتوں میں کسان تحریک صنعتی مزدور اور طالبعلم شامل ہوں کے ذریعے ممکن ہے جس کا ایک ٹریلر 69-1968 میں ایوب خان کے خلاف ملک گیر سطح پر ایک کامیاب تحریک کی شکل میں چل چکا ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ معاشرے میں مہنگائی بے روزگاری اور بیوروکریسی کی رشوت خوری وافراتفری سے تنگ آ کر عوام خود بخود گلی کوچوں میں اور سڑکوں پر نکل آئیں گے۔ ایسا ہرگز نہیں ہوگا بلکہ ... پاکستان میں جتنے لیفٹ کے گروپس ہیں ان کو کسانوں، مزدوروں، طالب علموں، خواتین اور شہری بے روزگار نوجوانوں کو منظم کرنا ہوگا۔ اس مقصد کے لیے پاکستان میں ایک ملک گیر منظم بائیں بازو کی پارٹی کی ضرورت ہے جو سٹڈی سرکلز، سیمینارز، جلسہ وجلوس، لٹریچر اور پراپیگنڈہ کے ذریعے محنت کش عوام کی تربیت کرے اور ان میں طبقاتی شعور وجدوجہد کے مقاصد اجاگر کرے

حرف آخر: ایسا کام یا انقلاب جس کے نتیجے میں پاکستان میں سامراج سے آزادی اور محنت کشوں کا راج قائم ہو سکے اس کے لئے سازگار حالات کئی بار آئیں گے اور آ کر چلے جائیں گے اگر ہمارے پس ایک منظم انقلابی اور آہنی ڈسپلن والی محنت کشوں کی سیاسی جماعت نہیں ہوگی۔ مدتوں پہلے کارل مارکس اور فریدرک اینگلز وہ پہلی شخصیات تھیں جنھوں نے ہیگل کے فلسفے کو نہ صرف سمجھا بلکہ اسے خیال پرستی یا آئیڈلزم سے نکال کر پیش کیا۔ فلسفے کی دنیا میں یہ ایک طرح سے بڑا انقلاب تھا۔ ان کے بعد لینن جیسا جہدکار ہی وہ واحد شخص تھا جس نے پہلی بار مارکس کی آفاقی کتاب داس کیپیٹل کو نہ صرف سمجھا بلکہ اسے بحثوں اور لائبریریوں سے نکال کر عملی انقلاب کی شکل میں ڈھالا۔ وہ مارکس کے اس قول پر پورا اترا کہ فلسفیوں نے محض اس دنیا کی تشریح کی ہے جب کہ حقیقت میں اسے بدلنا ضروری ہے لیکن نے نہ صرف مارکرم کو پڑھا بلکہ یہ ثابت کیا کہ نظام شعوری کوشش اور سیاسی طاقت سے ہی بدلا جا سکتا ہے۔ لیکن نے تین چیزوں پر سب سے زیادہ زور دیا کہ محنت کش طبقہ خود بہ خود انقلابی شعور حاصل نہیں کر سکتا اس کے لئے ایک منظم نظریاتی اور نظم وضبط کی حامل پارٹی ہی اسے شعور دے کر اس نظام (سرمایہ داری وسامراجی) کو گرانے کے لئے ایک چنگاری کے طور پر استعمال ہو سکتی ہے

لینن کہتا ہے کہ سامراج اپنے آخری دنوں میں بحرانوں کو ٹالنے کے لئے نئی نئی منڈیاں ڈھونڈتا ہے اس لوٹ مار میں وہ باؤلا ہو چکا ہوتا ہے (جیسے آجکل امریکہ ہو رہا ہے) اور اس لوٹ مار میں اپنی عالمی ساکھ کو دن بہ دن کمزور کرتا جاتا ہے

لینن نے ریاست کو ایک طبقے کا دوسرے طبقے پر غالب آنے کا اوزار قرار دیا ہے اس نے یہ واضح کیا کہ انقلاب کے بعد محنت کش طبقے کی آمریت ایک (عارضی مرحلہ) ہوگی

پاکستان اور بلوچستان

سیاسی بحران، معاشی سسکیاں اور محرومیاں

تحریر: محمد نسیم رنزو ریار (چمن بلوچستان)

سرمایہ دارانہ نظام میں نام نہاد جمہوریت جس میں ایک فی صد طبقہ غالب ہوتا ہے اور باقی ننانوے فیصد شامل بھی نہیں ہوتے ☆☆

پاکستان اس وقت اپنی تاریخ کے اس موڑ پر کھڑا ہے جہاں سیاسی ہیجان، معاشی دیوالیہ پن کی بازگشت اور سماجی بے چینی نے ریاست کے ڈھانچے کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے۔ ملکی سیاست میں استحکام کا خواب ایک ایسی سراب بن چکا ہے جس کے پیچھے دوڑتے دوڑتے عوام تھک چکے ہیں۔ وفاقی سطح پر اقتدار کی کھینچا تانی، اداروں کے درمیان ٹکراؤ اور پالیسیوں میں تسلسل کے فقدان نے ایک ایسا خلا پیدا کر دیا ہے جسے پُر کرنا فی الحال ناممکن نظر آتا ہے۔ اس سیاسی عدم استحکام کا سب سے گہرا اور تکلیف دہ سایہ صوبہ بلوچستان پر پڑ رہا ہے، جو رقبے کے لحاظ سے پاکستان کا نصف ہونے کے باوجود وفاق کی ترجیحات میں ہمیشہ حاشیے پر رہا ہے۔ بلوچستان کی سیاسی صورتحال محض اقتدار کی تبدیلی کا نام نہیں بلکہ یہ دہائیوں پر محیط اس احساسِ محرومی کا شاخسانہ ہے جسے کبھی سنجیدگی سے مداوا کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ صوبے میں سیاسی نمائندگی کا بحران اور مقامی قیادت کا وفاق سے کٹاؤ ایک ایسی خلیج پیدا کر چکا ہے جو ریاست اور شہری کے درمیان اعتماد کے رشتے کو کمزور کر رہی ہے۔ یہاں کی سیاست میں اسٹیبلشمنٹ کا اثر و رسوخ اور عوامی مینڈیٹ کی مبینہ پامالی نے نوجوان نسل میں بیگانگی کی لہر دوڑا دی ہے، جو کہ کسی بھی ریاست کے لیے لمحہ فکریہ ہے۔ معاشی محاذ پر نظر ڈالی جائے تو بلوچستان قدرت کے بے پناہ خزانوں، معدنیات اور طویل ساحلی پٹی سے مالا مال ہونے کے باوجود پسماندگی کی تصویر بنا ہوا ہے۔ ریکوڈک اور سیندک جیسے منصوبے ہوں یا گوادر کی بندرگاہ، ان تمام وسائل کی موجودگی کے باوجود مقامی آبادی کی زندگی میں کوئی مثبت تبدیلی نہیں آئی۔ علاقائی معاشی مسائل کی جڑیں اس استحصالی نظام میں پیوست ہیں جہاں وسائل تو نکالے جاتے ہیں لیکن ان کا ثمر مقامی لوگوں تک نہیں پہنچتا۔ سی پیک (CPEC) جیسے عظیم الشان منصوبے کو گیم چینجر قرار دیا گیا، لیکن بلوچستان کے عام آدمی کے لیے یہ اب بھی ایک دور کا خواب ہے۔ گوادر کے ماہی گیر آج بھی اپنے معاش کے لیے پریشان ہیں اور بنیادی انسانی ضرورتوں سے محروم ہیں۔ معاشی ناہمواری نے بے روزگاری کے ایسے عفریت کو جنم دیا ہے جس نے یہاں کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو مایوسی کی دلدل میں دھکیل دیا ہے۔ جب ایک ڈگری ہولڈر نوجوان کو اپنے ہی صوبے کے قدرتی وسائل میں حصہ نہیں ملتا اور وہ فاقہ کشی پر مجبور ہوتا ہے، تو معاشرے میں انتہاء پسندی اور بے چینی کے جذبات کا پروان چڑھنا فطری عمل بن جاتا ہے۔ تعلیمی سہولیات کا فقدان بلوچستان کا ایک اور المیہ ہے جو نسلوں کو تاریکی میں دھکیل رہا ہے۔ صوبے کے دور افتادہ علاقوں میں اسکولوں کی عمارتیں تو موجود ہیں لیکن وہاں اساتذہ غائب ہیں، یا پھر اسکول " گوسٹ اسکولز " کی شکل اختیار کر چکے ہیں۔ جہاں اسکول فعال ہیں، وہاں پینے کا صاف پانی، بیت الخلاء اور بجلی جیسی بنیادی ضرورتیں مفقود ہیں۔ کوئٹہ جیسے شہروں کو چھوڑ کر باقی صوبے میں اعلیٰ تعلیم کے مراکز نہ ہونے کے برابر ہیں۔ تعلیمی پسماندگی نے شعور کی اس سطح کو دبایا ہوا ہے جو حقوق کی جدوجہد کے لیے ضروری ہے۔ ڈیجیٹل دور میں جہاں دنیا مصنوعی ذہانت اور ٹیکنالوجی کے ذریعے چاند پر کمند ڈال رہی ہے، بلوچستان کے اضلاع مکران، قلات اور دیگر سرحدی علاقوں میں انٹرنیٹ کی سہولت یا تو سرے سے موجود نہیں یا سیکیورٹی کے نام پر معطل رہتی ہے۔ انٹرنیٹ کی عدم دستیابی نے یہاں کے نوجوانوں کو فری لانسنگ، ای کامرس اور عالمی منڈی سے کاٹ کر رکھ دیا ہے، جس سے معاشی محرومی میں مزید اضافہ ہوا ہے۔ بجلی اور توانائی کا بحران بلوچستان کے عوام کے لیے ایک عذابِ مسلسل بن چکا ہے۔ ایران سے بجلی کی درآمد کے باوجود مکران بیلٹ اور دیگر علاقے گھنٹوں طویل لوڈ شیڈنگ کا شکار رہتے ہیں۔ سردیوں میں گیس کی عدم دستیابی اور گرمیوں میں بجلی کا غائب ہونا یہاں کا معمول ہے۔ زراعت، جو کہ بلوچستان کی معیشت کی ریڑھ کی ہڈی ہے، بجلی کی قلت اور ٹیوب ویلوں کے نہ چلنے کی وجہ سے تباہ ہو رہی ہے۔ زمیندار قرضوں کے بوجھ تلے دبے ہوئے ہیں اور باغات خشک ہو رہے ہیں۔ رہی سہی کسر مہنگائی کے طوفان نے نکال دی ہے، جس نے غریب اور متوسط طبقے کی کمر توڑ دی ہے۔ اشیائے خورد و نوش کی قیمتیں آسمان سے باتیں کر رہی ہیں اور عام آدمی کے لیے دو وقت کی روٹی کا حصول ایک جہاد بن گیا ہے۔ پیٹرولیم مصنوعات کی قیمتوں میں اضافے نے ہر چیز کو عام آدمی کی پہنچ سے دور کر دیا ہے، جس کے نتیجے میں سماجی جرائم اور ذہنی تناؤ میں تشویشناک حد تک اضافہ ہوا ہے۔ بلوچستان کے مسائل کا حل محض بیانات اور کاغذی منصوبوں میں نہیں بلکہ مخلصانہ سیاسی عزم اور وسائل کی منصفانہ تقسیم میں پوشیدہ ہے۔ جب تک یہاں کے عوام کو ان کے وسائل پر اختیار نہیں دیا جائے گا، جب تک تعلیم اور صحت کو ترجیح نہیں بنایا جائے گا، اور جب تک ڈیجیٹل تقسیم کو ختم کر کے نوجوانوں کو انٹرنیٹ

یکم مئی 1886 اور یکم مئی 2026 بدلتے حالات، برقرار مسائل

جیسی بنیادی سہولیات فراہم نہیں کی جائیں گی، تب تک ترقی کا ہر دعویٰ کھوکھلا رہے گا۔

☆☆☆

یکم مئی دنیا بھر کے محنت کشوں کے لیے جدوجہد، قربانی اور حقوق کی علامت ہے۔ یہ دن صرف ایک تاریخ نہیں بلکہ ایک تحریک کی یادگار ہے جس نے مزدوروں کو ان کا مقام دلانے کے لیے طویل جدوجہد کی یکم مئی 1986 سے سے لے کر یکم مئی 2026 تک کا سفر ہمیں یہ دکھاتا ہے کہ وقت کے ساتھ حالات بدلے ضرور ہیں، مگر محنت کشوں کے مسائل آج بھی حل نہیں ہو سکے 1886 میں امریکہ کے شہر شکاگو میں مزدوروں نے اپنے حقوق کے لیے آواز بلند کی۔ ان کا بنیادی مطالبہ آٹھ گھنٹے اوقات کار کا تھا۔ اس وقت مزدوروں سے دن کے بارہ سے سولہ گھنٹے تک کام لیا جاتا تھا، جبکہ اجرت بھی نہایت کم ہوتی تھی، یکم مئی کو ہزاروں مزدور سڑکوں پر نکل آئے اور اپنے حقوق کے لیے پرامن احتجاج کیا۔ یہ تحریک بعد میں ''ہیمارکیٹ واقعہ'' کے نام سے مشہور ہوئی، جہاں پولیس اور مظاہرین کے درمیان تصادم ہوا اور کئی لوگ جان سے گئے۔ ان قربانیوں نے دنیا کو یہ سبق دیا کہ مزدوروں کے حقوق کے لیے جدوجہد ناگزیر ہے۔ اور سرمایہ داری نظام کے خاتمے اور مزدور کسان راج کے قیام سے ہی محنت کش عوام کے مسائل حل ہونگے مزدور طبقے کی مسلسل جدوجہد سے وقت کے ساتھ ساتھ مزدوروں کے حالات میں بہتری آئی مختلف ممالک میں لیبر قوانین بنائے گئے، اوقات کار کو محدود کیا گیا، اور اجرتوں میں اضافہ ہوا۔ یونینز قائم ہوئیں جنہوں نے مزدوروں کی نمائندگی کی۔ مگر اس کے باوجود استحصال مکمل طور پر ختم نہ ہو سکا اور استحصال کے نئے نئے طریقے سرمایہ داری نظام نے اپنا لیے۔

اگر ہم یکم مئی 2026 کی بات کریں تو دنیا ایک نئے دور میں داخل ہو چکی ہے۔ ٹیکنالوجی، آٹومیشن اور مصنوعی ذہانت نے کام کے انداز کو بدل دیا ہے۔ اب فیکٹریوں کی جگہ مشینیں لے رہی ہیں اور بہت سے لوگ بے روزگاری کا شکار ہو رہے ہیں۔ ''گگ اکانومی'' نے وقتی روزگار کو فروغ دیا ہے، مگر اس میں بھی ملازمین کو مستقل تحفظ حاصل نہیں۔ مزدور اب صرف جسمانی مشقت تک محدود نہیں بلکہ ذہنی دباؤ غیر یقینی ملازمت اور کمزور سوشل سیکیورٹی جیسے مسائل کا سامنا کر رہے ہیں۔ ترقی یافتہ ممالک میں اگرچہ مزدوروں کو بہتر سہولیات حاصل ہیں، مگر پاکستان جیسے ترقی پذیر ممالک میں آج بھی بہت سے مزدور بنیادی حقوق سے محروم ہیں۔ کم اجرت، طویل اوقات کار اور غیر محفوظ ماحول جیسے مسائل عام ہیں۔ خاص طور پر خواتین اور بچوں سے کم اجرت پر مزدوری کروانا ایک سنگین مسئلہ ہے۔

یکم مئی 2026 ہمیں یہ یاد دلاتا ہے کہ اگرچہ ہم نے 1886 کے بعد بہت مادی ترقی کی ہے، مگر ابھی بھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ ہمیں مزدوروں کے حقوق کے تحفظ کے لیے مزید موثر قوانین بنانے ہوں گے اور ان پر سختی سے عملدرآمد بھی یقینی بنانا ہوگا۔ ساتھ ہی تعلیم مہارتوں کی تربیت اور جدید ٹیکنالوجی کے مطابق مزدوروں کو تیار کرنا بھی ضروری ہے یکم مئی کا دن ہمیں ماضی کی قربانیوں کو یاد رکھنے اور مستقبل کے لیے ایک بہتر لائحہ عمل بنانے کا پیغام دیتا ہے۔ آج جب ہم یکم مئی منا رہے ہیں پاکستان میں مزدوروں کے مسائل صرف معاشی نہیں بلکہ قانونی، سماجی اور انتظامی نوعیت کے بھی ہیں جس کی وجہ سے محنت کش طبقہ آج بھی متعدد مسائل اور مشکلات کا شکار ہے۔

پاکستان میں مزدوروں کے تحفظ کے لیے مختلف قوانین بنائے گئے ہیں، جیسے فیکٹریز ایکٹ شاپس اینڈ اسٹیبلشمنٹ آرڈیننس اور سوشل سیکیورٹی قوانین 18 ویں آئینی ترمیم کے بعد لیبر کا شعبہ صوبوں کے حوالے کر دیا گیا، جس کے نتیجے میں ہر صوبے نے اپنے قوانین بنائے مختلف صوبوں میں جو قوانین بنے ہیں اس میں بہت تضاد ہے اور پنجاب میں جو لیبر کوڈ اسمبلی نے بنایا ہے وہ مزدور دشمن ہے اس میں سرمایہ داروں کا تحفظ کیا گیا ہے ہم اسے مسترد کرتے ہوئے مطالبہ کرتے ہیں کہ مزدور تنظیموں کی رائے کے مطابق لیبر کوڈ بنایا جائے۔ اگرچہ حکومت پر سال کم از کم اجرت مقرر کرتی ہے، لیکن اس پر عملدرآمد نہیں ہوتا پاکستان میں تقریباً 60 سے 70 فیصد مزدور غیر رسمی شعبے سے وابستہ ہیں، جہاں نہ کوئی معاہدہ ہوتا ہے نہ ہی یونین بننے دی جاتی ہے اور نہ ہی قانونی تحفظ ایسے مزدور سوشل سیکیورٹی پنشن اور دیگر سہولیات سے محروم رہتے ہیں۔

ایک نہایت اہم اور بنیادی مسئلہ ہے، جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ٹھیکے داری نظام یونین سازی اور ریفرنڈم کے حوالے سے بڑی رکاوٹ بن چکا ہے۔ اس نظام میں مزدور براہ راست ادارے کے ملازم نہیں ہوئے بلکہ ایک ٹھیکیدار کے ذریعے رکھے جاتے ہیں اور مالک خود کو قانونی ذمہ داریوں سے الگ کر لیتا ہے اور آجر یا مالک، کمپنیاں یونین سازی کے ساتھ ساتھ ای او بی آئی، سوشل سیکورٹی اور لیبر قوانین کے اطلاق سے نکل جاتی ہیں۔ مزدوروں کی نمائندہ سی بی اے کے انتخاب کے لیے جو ریفرنڈم ہوتا ہے۔ اس میں صرف مستقل ملازمین کو شامل کیا جاتا ہے۔ ٹھیکے کے مزدور، چاہے وہ سالوں سے کام کر رہے ہوں، ووٹ کے حق سے محروم رہتے ہیں

مزدور ساتھیو! مزدوروں کے تمام مسائل کے حل کی چابی ہمارے اتحاد اور جدوجہد میں موجود ہے جتنے بڑے پیچیدہ اور گھمبیر مسائل کا سامنا آج پاکستان کے مزدور طبقے کو ہے اس کا تقاضا ہے۔ کہ

1۔ مزدور تنظیمیں اپنے مسائل کی جدوجہد کے لئے ایک متحدہ محاذ قائم کریں۔

2۔ مسائل کو ترجیحی بنیادوں پر اٹھایا جائے اور بڑے مسائل پر سب سے پہلے آواز بلند کی جائے۔

3۔ پاکستان کے دیگر محنت کشوں، کسانوں، طلباء اور مزدور دوست سیاسی قوتوں

اجلاس فیڈرل کمیٹی/مرکزی کمیٹی مورخہ 4،5 اپریل 2026 لاہور

فیصلہ جات

کے ساتھ مل کر جدوجہد کی جائے۔

جاریکردہ: عوامی ورکرز پارٹی پاکستان ٹریڈ یونین فیڈریشن، نیشنل سٹوڈنٹس فیڈریشن۔

ممبر شپ۔ پارٹی کے تمام بنیادی یونٹس اس امر کو یقینی بنائیں گے کہ ممبر شپ کے معیار کو آئین کی شق نمبر 2۔2 (جس کے مطابق ہر ممبر کیلئے ماہانہ فنڈ کی ادائیگی اور پارٹی فرنٹ میں کام کی ذمہ داری ہے) کے مطابق بڑھایا جائے گا۔ پارٹی ممبران کو شعوری اور تنظیمی طور منظّم کیا جائے گا تا کہ پارٹی کی حقیقی قوت میں اضافہ ہو سکے

2۔ تعلیم و تربیت۔ وفاقی سیکرٹری تعلیم و تربیت نے پارٹی ممبران کی تعلیم و تربیت کیلئے ایک سلیبس تیار کر لیا ہے جس کو حتمی شکل دے کر 15 دن کے اندر پارٹی واٹس اپ گروپ پر آپ لوڈ کر دیا جائے گا۔

3۔ لیبر فرنٹ۔۔ وفاقی سیکرٹری لیبر کامریڈ جمیل شاہد ایڈوکیٹ نے PTUF اور سندھ میں لیبر فرنٹ پر ہونے والے کام کی تحریری رپورٹ پیش کی فیصلہ کیا گیا کہ وفاقی سیکرٹری آئندہ پورے پاکستان میں لیبر فرنٹ پر ہونے والے کام کی رپورٹ پیش کریں گے۔ صوبائی سیکرٹریز سیرابط کریں گے PTUF کے علاوہ دیگر مزدور تنظیمیں جو پارٹی کے قریب ہیں ان سے بھی روابط قائم کیے جائیں گے۔

4۔۔ کسان فرنٹ۔ وفاقی سیکرٹری کسان اقبال ملک نے ملک میں کسانوں درپیش مسائل کا ذکر کیا اور کسان کمیٹی کو فعال کرنے کے لیے 8 مارچ کو ٹوبہ ٹیک سنگھ میں پارٹی رہنماوں کے ساتھ ہونے والی میٹنگ کی رپورٹ پیش کی کسان کمیٹی کو پنجاب اور سرائیکی وسیب میں منظّم کرنے کیلیے 8 رکنی کمیٹی تشکیل دی گئی جس میں پنجاب سے میاں امداد حسین، زبیر چوہدری، راوشار اور علی شفیق شامل ہیں سرائیکی وسیب سے نواز پاندہ، چوہدری اسماعیل، راو عامر اظہار، اور مہر وقار حسین نامزد کر دئے گئے جو جلد ہی اپنا اجلاس منعقد کر کے آئندہ کا لائحہ عمل طے کریں گے علاوہ ازیں وفاقی سیکرٹری کسان دیگر صوبوں میں کسانوں کو درپیش مسائل زراعت کی مجموعی صورتحال اور کسانوں کو منظّم کرنے کے امکانات بارے رپورٹ تیار کرینگے۔

5۔ طلبا یوتھ فرنٹ۔ یوتھ سیکرٹری سید احتشام اکبر نے NSF کے ساتھ مشترکہ سرگرمیوں کی رپورٹ پیش کی فیصلہ کیا گیا کہ NSF کے ساتھ ورکنگ ریلیشن شپ کو مزید وسعت دی جائے گی اور طلباء کے علاوہ عام بے روزگار نوجوانوں کو پارٹی میں شامل کرنے کے لئے جامع پروگرام ترتیب دیا جائے گا۔

6۔ سوشل میڈیا اور عوامی جمہوریت۔ اجلاس میں فیصلہ کیا گیا کہ عوامی جمہوریت کی اشاعت کا کام جاری رکھا جائے گا، اگلا شمارہ مئی کے مہینہ میں شائع ہو جائے گا جس کیلئے ادارتی بورڈ کے ممبران دلاور عباس صدیقی اور اثر امام 15 دن میں اپنے مضامین تحریر کر دیں گے جناب زاہد پرویز صاحب موجودہ معاشی صورتحال پر عوامی جمہوریت کیلئے مضمون لکھیں گے پارٹی اخبار کی تقسیم سے پڑھنے والوں سے مسلسل رابطہ رہتا ہے۔ سوشل میڈیا کو موثر طریقہ سے استعمال کیا جائے گا پارٹی کیلئے یوٹیوب چینل کے قیام کیلئے عابدہ چوہدری اور دلاور عباس صدیقی نے مشترکہ طور پر ذمہ داری لی جس کیلئے ابتدائی کام جلد ہی شروع کیا جائے گا۔

7۔ پارٹی منشور و سیاسی دستاویز۔ فیڈرل کمیٹی کے اوورسیز پاکستانی ممبران کی تجویز کو مدنظر رکھتے ہوئے فیصلہ کیا گیا کہ پارٹی منشور اور سیاسی دستاویز کا انگریزی زبان میں ترجمہ کیا جائے گا اس کام کو صدر صاحب اپنی نگرانی میں 15 یوم کے اندر مکمل کرائیں گے۔۔

8۔ وومن فرنٹ۔ خواتین فرنٹ پر کام نہ ہونے کی وجوہات کا جائزہ لیا گیا فیصلہ کیا گیا کہ صوبائی اکائیوں کی قیادت اپنے اضلاع میں خواتین کی میٹنگ کا انتظام کرے گی جس میں وفاقی وومن سیکرٹری شرکت کریں گی 18 اپریل کو سانگھڑ (سندھ) میں ہونے والی ہاری کانفرنس کے موقع پر خواتین کی علیحدہ سے ایک میٹنگ کا انعقاد کیا جائے گا جس میں وفاقی سیکرٹری وومن شریک ہوں گی۔

9۔ متحدہ محاذ۔۔ فیصلہ کیا گیا کہ ملکی اور بین الاقوامی صورت حال مشرق وسطی اور امریکہ ایران جنگ کے تناظر صدر صاحب کو اختیار دیا۔ گیا کہ وہ دوسری ترقی پسند، جمہوری اور قوم پرست جماعتوں کو اس مقصد کیلئے ایک خط تحریر کریں تا کہ ڈائیلاگ کو اوپن کیا جا سکے

10۔۔ فنڈ۔ سیکرٹری خزانہ فیڈرل کمیٹی کے اراکین کے ذمہ واجبات کی لسٹ فوری طور پر ہاوس میں پیش کریں گے اور تمام ممبران آپنے بقایا جات کلیر کریں گے اس فیصلہ پر اگلے روز یعنی 5 اپریل کو عملدرآمد کر دیا گیا۔ فنڈ ریزنگ کیلئے صدر صاحب اور فیڈرل کمیٹی اراکین مشترکہ طور مختلف آپشنز پر کام جاری رکھیں گے۔

12۔پارٹی قیادت کا دورہ۔۔فیصلہ کیا گیا کہ پارٹی قیادت جون کے مہینہ میں خیبر پختون خواہ میں تنظیمی دورہ کرے گی مختلف اضلاع میں ورکرز کنونشن منعقد کیے جائیں گے سرائیکی وسیب اور بلوچستان کے دوست اپنی صوبائی/نیشنل کمیٹی کے اجلاس منعقد کر کے شیڈول طے کریں گے۔

۔12۔۔اجلاس میں کیے گئے فیصلہ پر عملدرآمد کیلئے مرکزی جنرل سیکرٹری اپنی ذمہ داری پوری کرینگے صوبائی قیادت اور شعبہ جاتی سیکرٹریز صاحبان کے ساتھ رابطہ رکھا جائے گا۔۔۔ جاری کردہ۔فرحت عباس خان جنرل سیکرٹری AWP آج 10 اپریل 2026 کو عوامی ورکرز پارٹی ضلع سانگھڑ کی ایک میٹنگ ضلعی صدر عبدالقیوم لانڈر کی صدارت میں منعقد ہوئی، جس میں درج ذیل فیصلے کیے گئے:

(1) کامریڈ حسن عسکری کی سالگرہ 13 اپریل 2026 بروز پیر شام 4 بجے سٹیزن ایکشن کمیٹی کے دفتر میں منائی جائے گی۔اس سلسلے میں ایک انتظامی کمیٹی تشکیل دی گئی، جس کے اراکین یہ ہیں:

(1) میر حسن مری (2) ذوالفقار علی (3) سعید بگٹی (4) محبوب

(2) 22 اپریل کو ولادیمیر لینن کی سالگرہ ہے، جو شام 4 بجے سٹیزن ایکشن کمیٹی کے دفتر میں کیک کاٹ کر منائی جائے گی۔

کامریڈ حسن عسکری کے گاؤں کی لائبریری کو منتقل کر کے شہری ایکشن کمیٹی سانگھڑ کے دفتر میں قائم کیا جائے گا۔کتابوں کی منتقلی کے لیے تین رکنی کمیٹی تشکیل دی گئی:

(1) میر حسن مری (2) محمد عظیم رونجھو (3) وحید حسین بگٹی

,, (4) 18 اپریل کو طے شدہ کامریڈ حسن عسکری ہاری کانفرنس کو دو ماہ کے لیے مؤخر کر کے جون کے مہینے میں منعقد کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔

(5) سانگھڑ پارٹی کے لیے 30 جھنڈے تیار کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ضلعی صدر 22 اپریل تک اس حوالے سے رپورٹ پیش کریں گے۔

(6) یومِ مئی کو بھرپور انداز میں منانے کے لیے 22 اپریل کو لینن کی سالگرہ کے بعد ایک میٹنگ کی جائے گی۔

(7) سٹیزن ایکشن کمیٹی سانگھڑ کے دفتر کا باقی ماندہ کرایہ ادا کرنے کے لیے سعید بگٹی اراکین کو بقایاجات کی فہرست فراہم کریں گے اور وصولی کریں گے۔

(8) سانگھڑ یونٹ کی میٹنگ ہر مہینے کے پہلے جمعہ کو شام 4 بجے منعقد کی جائے گی

عوامی ورکرز پارٹی ضلع شیخوپورہ کا کنونشن

پاکستان کے حکمران مزدور دشمن قوانین بنا رہے ہیں۔یہ عالمی سامراج کے ایجنٹ ہیں۔عوامی ورکرز پارٹی ہر دم مزدور طبقے کے مفادات کے لئے جدوجہد جاری رکھے گی۔ان خیالات کا اظہار عوامی ورکرز پارٹی کے صدر کامریڈ اختر حسین نے آج اتحاد کیمیکلز میں عوامی ورکرز پارٹی ضلع شیخوپورہ کے کنونشن سے خطاب کرتے ہوئے کیا۔عوامی ورکرز پارٹی شیخوپورہ کے کنونشن میں مزدوروں اور محنت کشوں کی بڑی تعداد نے شرکت کی۔کنونشن کی صدارت عوامی ورکرز پارٹی ضلع شیخوپورہ کے صدر اور ایمپلائز لیبر یونین سی بی اے کے صدر رانا عابد حسین نے کی۔۔کنونشن سے خطاب کرتے ہوئے عوامی ورکرز پارٹی پاکستان کے صدر کامریڈ اختر حسین نے کہا ہماری پارٹی مزدوروں کسانوں اور محنت کش طبقات کی پارٹی ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ مزدور طبقہ اس پارٹی کی قیادت کرے تاکہ مزدور طبقے کی جدوجہد کو ٹریڈ یونین۔بونس اور دیگر مراعات لینے کی جدوجہد سے آگے بڑھا کر اسے پورے سماج کی تبدیلی کی جدوجہد میں بدلا جائے۔تاکہ محنت کش اس ملک کے تمام وسائل کے مالک بن سکیں۔انھوں نے پٹرول کی قیمتیں بڑھانے پر حکمران طبقے پر کڑی تنقید کرتے ہوئے کہا کہ پہلے ہی نہ عوام کے پاس روٹی ہے۔نہ روزگار۔نہ تعلیم۔نہ گھر کے لئے چھت اوپر سے عوام ہر پٹرول بم گرانا اس سرمایہ دار ریاست کی مکمل ناکامی کا ثبوت ہے۔انھوں نے کہا کہ ریاست کی زمہ داری ہے کہ وہ عوام کو تعلیم۔صحت۔روزگار اور گھر فراہم کرے لیکن سرمایہ دار اور ان کی ریاست صرف اپنی تجوریاں بھرنے میں مصروف ہے انھوں نے اتحاد کیمیکلز کے مزدوروں کو یقین دلایا کہ عوامی ورکرز پارٹی ہر دم۔ہر جدوجہد اور ان کے ہر مطالبے میں ڈٹ کر ان کا ساتھ دے گی۔کامریڈ اختر حسین نے کنونشن سے خطاب کرتے ہوئے مزید کہا کہ امریکی سامراج نے اس پورے خطے پر جنگ مسلط کر دی ہے جس سے یہ خطہ اور پوری دنیا بہت تیزی سے تباہی و بربادی کی طرف بڑھ رہی ہے انھوں نے کہا کہ عالمی سامراج کی شکست کی شروعات شروع ہو گئی ہے یہی وجہ ہے کہ امریکی سامراج کو اس کے اتحادی بھی چھوڑ رہے ہیں انھوں نے مطالبہ کیا کہ ایران کے خلاف امریکہ اور اسرائیل کی جارحیت بند کی جائے اور پورے مشرق وسطی سے تمام غیر ملکی افواج واپس جائیں اور فوجی اڈے ختم کیے جائیں۔۔کنونشن سے عوامی ورکرز پارٹی کے مرکزی جنرل سیکریٹری فرحت عباس خان۔پنجاب کے صدر پروفیسر امیر حمزہ ورک۔مرکزی سیکریٹری مالیات زاہد پرویز ایڈووکیٹ۔اور رانا عابد حسین نے بھی خطاب کیا

عوامی ورکرز پارٹی کی وفاقی کمیٹی کے اجلاس کے بعد جاری کردہ

اعلامیہ

لاہور (پریس ریلیز) عوامی ورکرز پارٹی کی فیڈرل کمیٹی کا دوروزہ اجلاس لاہور کی ہوٹل پاک ہیریٹیج کے کانفرنس ہال میں منعقد ہوا، جس میں ملک بھر سے صوبائی اور مرکزی قیادت نے شرکت کی۔ اجلاس میں ملکی و بین الاقوامی سیاسی، معاشی اور سماجی صورتحال کا تفصیلی جائزہ لیا گیا اور آئندہ کے لائحہ عمل پر غور کیا گیا۔ اجلاس کی صدارت پارٹی صدر اختر حسین ایڈووکیٹ نے کی جبکہ اجلاس کی کارروائی جنرل سیکریٹری فرحت عباس خان نے چلائی۔

اجلاس نے اس امر پر شدید تشویش کا اظہار کیا کہ ملک ایک گہرے سیاسی و معاشی بحران کی لپیٹ میں ہے۔ ہائبرڈ حکمران طبقے کی ناکام پالیسیوں، آئی ایم ایف کی کڑی شرائط، اور سامراجی دباؤ کے نتیجے میں عوام کی زندگی اجیرن ہو چکی ہے۔ مہنگائی، بے روزگاری، اور بنیادی سہولیات کی کمی نے محنت کش طبقے، کسانوں، طلبہ اور متوسط طبقے کو شدید مشکلات سے دوچار کر دیا ہے۔ جنگ ایران میں ہو رہی ہے، مہنگائی پاکستانی عوام کو بھگتنی پڑ رہی ہے؟ تیل کی قیمتوں میں ہوشربا اضافہ ملک میں مہنگائی کا طوفان لایا ہے۔ حکمرانوں کی کرپشن اور عوام دشمن پالیسیوں کی وجہ سے عوام کی زندگی اجیرن ہوگئی ہے۔ پارٹی نے مطالبہ کیا ہے کہ تیل کی قیمتوں میں ایران جنگ کے بعد کیا جانے والا اضافہ فی الفور واپس لیا جائے۔

فیڈرل کمیٹی نے واضح کیا کہ موجودہ ریاستی ڈھانچہ عوامی مفادات کے برعکس اشرافیہ کے مفادات کا محافظ ہے۔ ملک میں منی مارشل لا نافذ ہے۔ جمہوری آزادیوں پر قدغن، سیاسی کارکنان کی گرفتاریاں، میڈیا پر پابندیاں اور اظہارِ رائے کی آزادی کا گلا گھونٹنا قابلِ مذمت ہے۔ پاکستانی ملٹری اسٹیبلشمنٹ 78 برسوں سے مسلم امہ کا بیانیہ لے کر خود کو اسلام کا قلعہ کہتی رہی لیکن جب اس دعوے کو ثابت کرنے کا وقت آیا تو کہا گیا کسی اور ملک میں ہو رہے واقعات کی وجہ سے پاکستان میں احتجاج کی اجازت نہیں دی جائے گی۔

بین الاقوامی صورتحال پر بحث کرتے ہوئے اجلاس نے مشرقِ وسطیٰ میں بڑھتی ہوئی کشیدگی خصوصاً ایران کے خلاف جارحانہ اقدامات اور سامراجی جنگ پر شدید تشویش کا اظہار کیا۔ عوامی ورکرز پارٹی ہر قسم کی سامراجی مداخلت، جنگی جنون اور خطے کو عدم استحکام کا شکار بنانے کی کوششوں کی مذمت کرتی ہے۔ پارٹی ایران کے خلاف سامراجی جنگ فوری طور پر بند کرنے کا مطالبہ کرتے ہوئے ایرانی حکومت کی طرف سے پیش کیے گئے تمام مطالبات کی حمایت کرتی ہے۔ پارٹی کا موقف ہے کہ خطے کے مسائل کا حل مذاکرات، خودمختاری کے احترام اور عوامی امنگوں کے مطابق ہونا چاہیے، امریکہ یا کسی دوسری طاقت کو اجازت نہیں دی جاسکتی کہ وہ دنیا کی کسی بھی آزاد و خودمختار ملک میں اپنی مرضی کی حکومتیں قائم کراتی پھرے۔ اجلاس نے واضح کیا کہ سرمایہ دارانہ نظام بین الاقوامی طور پر اپنی وقعت کھو چکا ہے، جس کی بحالی کوئی آسان ہدف نہیں ہوگا۔ امریکہ اور اسرائیل کی طرف سے ایران کے خلاف جارحانہ جنگ کے نتیجے میں یہ خطہ بہت بڑی تبدیلیوں کا تجربہ کرے گا۔ مشرق وسطیٰ سے سامراجی فوجی اڈے ختم کرنے ہوں گے۔ پیٹرو ڈالر کی ہیجمنی ختم ہونے پر بہت سی ریاستیں حقیقی طور پر آزاد اور خودمختار بن جائیں گی۔ لیکن یہ سب کچھ حاصل کرنے کیلئے متبادل قوت کی ضرورت ہے۔

اجلاس نے اس بات پر زور دیا کہ پاکستان میں حقیقی جمہوریت، معاشی انصاف اور سماجی برابری کے حصول کے لیے ایک متبادل عوامی سیاست کی اشد ضرورت ہے۔ عوامی ورکرز پارٹی اس مقصد کے لیے محنت کشوں، کسانوں، خواتین، طلبہ اور محروم طبقات کو منظّم کرنے کے اپنے عزم کا اعادہ کرتی ہے۔

فیڈرل کمیٹی نے فیصلہ کیا کہ:

☆ سامراج مخالف احتجاجی مہم کو تیز تر کیا جائے گا۔

☆ ملک بھر میں تنظیم سازی کی مہم کو تیز کیا جائے گا

☆ مزدوروں اور کسانوں کے حقوق کے لیے عملی جدوجہد کو منظّم کیا جائے گا

☆ تعلیمی اداروں میں طلبہ یونینز کی بحالی کے لیے تحریک کو تقویت دی جائے گی

☆ خواتین اور اقلیتوں کے حقوق کے لیے آواز کو مزید بلند کیا جائے گا

☆ آئندہ عام انتخابات میں بھرپور سیاسی مداخلت کی تیاری کی جائے گی

عوامی ورکرز پارٹی ملک کی تمام کمیونسٹ، ترقی پسند، محبِّ وطن قوم پرستوں اور جمہوری قوتوں کو وسیع تر اتحاد میں منظّم ہونے کی اپیل کرتی ہے۔

اجلاس نے اس عزم کا اعادہ کیا کہ عوامی ورکرز پارٹی ایک ترقی پسند، جمہوری اور سوشلسٹ پاکستان کے قیام کے لیے اپنی جدوجہد جاری رکھے گی، جہاں ریاستی وسائل پر عوام کا حق ہو اور استحصال کا خاتمہ کیا جاسکے۔

جاری کردہ

اثر امام (مرکزی سیکرٹری اطلاعات) عوامی ورکرز پارٹی ☆☆

بلوچستان کو محض ایک جغرافیائی خطہ نہیں بلکہ وہاں بسنے والے انسانوں کو برابر کا شہری تسلیم کیا جائے

کامریڈ حیدر خوجہ

سیاسی ڈائیلاگ، معاشی خودمختاری اور سماجی انصاف ہی وہ راستے ہیں جو پاکستان کو استحکام اور بلوچستان کو خوشحالی کی راہ پر ڈال سکتے ہیں۔ وقت کا تقاضا ہے کہ ماضی کی غلطیوں سے سبق سیکھ کر ایک نئے معاہدے کی بنیاد رکھی جائے جہاں طاقت کا سرچشمہ عوام ہوں پریس ریلیز تاریخ: 7 اپریل 2025 کراچی۔ عوامی ورکرز پارٹی کراچی کمیٹی کی ماہانہ میٹنگ آج 7 اپریل 2025 کو پارٹی کے مرکزی دفتر، پیپوراما سینٹر ورکرز ہال میں منعقد ہوئی۔ اجلاس کی صدارت کامریڈ شفیع شیخ اور نائب صدر کامریڈ اشتیاق عظمیٰ نے مشترکہ طور پر کی۔ اجلاس میں ملک کی موجودہ سیاسی و معاشی صورتحال، بالخصوص بڑھتے ہوئے معاشی بحران، مہنگائی اور عالمی سطح پر جاری جنگی حالات کے پاکستان پر اثرات کا تفصیلی جائزہ لیا گیا۔ شرکاء نے اس امر پر شدید تشویش کا اظہار کیا کہ عالمی سرمایہ دارانہ نظام، امریکی سامراجی پالیسیوں اور خطے میں جاری کشیدگی کے باعث پاکستان سمیت ترقی پذیر ممالک کو شدید معاشی دباؤ اور مہنگائی کا سامنا ہے۔ کراچی کمیٹی نے متفقہ طور پر فیصلہ کیا کہ شہر بھر میں مہنگائی کے خلاف منظم احتجاجی تحریک کا آغاز کیا جائے گا۔ اس سلسلے میں مختلف علاقوں میں عوامی رابطہ مہم چلانے اور احتجاجی مظاہروں کا انعقاد کیا جائے گا تاکہ محنت کش طبقے کی آواز کو مؤثر انداز میں بلند کیا جا سکے۔ اجلاس میں یکم مئی (یومِ مزدور) کے حوالے سے بھی اہم فیصلے کیے گئے۔ یہ طے پایا کہ تمام بائیں بازو کی سیاسی جماعتوں، ٹریڈ یونینز اور لیبر تنظیموں کے ساتھ مل کر مشترکہ طور پر یومِ مزدور کا بھرپور انداز میں پروگرام منعقد کیا جائے گا، جس کا مقصد محنت کشوں کے حقوق کے لیے جدوجہد کو مزید مضبوط بنانا ہے۔ اس موقع پر عوامی ورکرز پارٹی (پاکستان) کے مرکزی لیبر سیکرٹری، کامریڈ محمد جمیل شاہد نے لاہور میں منعقد ہونے والی دو روزہ مرکزی فیڈرل کمیٹی کے اجلاس کے حوالے سے شرکا کو تفصیلی بریفنگ دی اور پارٹی کی آئندہ حکمت عملی سے آگاہ کیا۔ اجلاس میں عوامی ورکرز پارٹی کے مرکزی صدر، کامریڈ اختر حسین ایڈووکیٹ نے بھی شرکت کی اور خطاب کرتے ہوئے عالمی معاشی و سیاسی حالات کا گہرائی سے تجزیہ پیش کیا۔ انہوں نے کہا کہ موجودہ عالمی بحران سرمایہ دارانہ نظام کی اندرونی تضادات کا نتیجہ ہے، جہاں ڈالر پر مبنی معیشت اور پیٹرو ڈالر نظام عالمی عدم استحکام کو بڑھا رہے ہیں۔

انہوں نے مزید کہا کہ دنیا تیزی سے یک قطبی نظام سے کثیر قطبی نظام (ملٹی پولر ورلڈ) کی جانب بڑھ رہی ہے، جس میں برکس (BRICS) جیسے اتحاد اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ برکس ممالک کی جانب سے مقامی کرنسیوں میں تجارت اور متبادل معاشی نظام کی کوششیں امریکی بالادستی کے لیے ایک چیلنج بن رہی ہیں۔ کامریڈ اختر حسین نے عالمی سطح پر توانائی کے وسائل، خصوصاً تیل پر قبضے کی سامراجی پالیسیوں کو جنگوں کی بنیادی وجہ قرار دیا اور کہا کہ مشرقِ وسطیٰ میں جاری کشیدگی اسی تناظر کا حصہ ہے۔ انہوں نے خبردار کیا کہ اگر خطے میں جنگ کا دائرہ وسیع ہوا تو اس کے نہایت تباہ کن اثرات مرتب ہوں گے۔ انہوں نے اس بات پر بھی زور دیا کہ عالمی سطح پر بدلتی ہوئی صورتحال میں صرف اسی صورت مثبت تبدیلی ممکن ہے جب مضبوط سیاسی اور عوامی قوتیں موجود ہوں جو اس بحران کو عوام کے حق میں تبدیل کر سکیں۔ بصورت دیگر سرمایہ دارانہ نظام مختلف طریقوں سے اپنے بحرانوں کو وقتی طور پر حل کرتا رہے گا۔ اجلاس کے شرکاء نے عالمی جنگی صورتحال، عوام دشمن معاشی پالیسیوں اور مہنگائی کے خلاف بھرپور جدوجہد جاری رکھنے کے عزم کا اعادہ کیا۔ اس بات پر بھی زور دیا گیا کہ عوام کو منظم کر کے ایک متبادل سیاسی و معاشی نظام کی جدوجہد کو آگے بڑھایا جائے تاکہ ایک منصفانہ اور مساوی معاشرہ قائم کیا جا سکے۔

جاری کردہ: کامریڈ حیدر خوجہ (سیکرٹری اطلاعات عوامی ورکرز پارٹی کراچی)

آپ کو علم ہے کہ پاکستان ایک کثیر القومی، کثیر الطبقاتی ریاست اور کثیر

ضروری گزارش

عوامی جمہوریت کے قلمکاروں سے درخواست ہے کہ اپنی نگارشات اور سرگرمیوں کی رپورٹس کمپوز کرا کے ان پیج یا ورڈ میں ارسال کریں۔ اشاعت کے لیے بھیجی گئی تصاویر منتخب کر کے بھیجیں ادارہ آپ کا شکر گزار ہوگا۔

بائیں بازو، ترقی پسند قوم پرست جمہوری سیاسی پارٹیوں اور عوامی محاذوں سے اتحاد کی اپیل

عوامی ورکرز پارٹی کی طرف سے کھلا خط

التشکیلاتی سماج ہے اور آزادی کے 78 سال گذر جانے کے باوجود عوامی نقطہ نظر سے اس کی معاشی وسماجی حالت میں کوئی بنیادی تبدیلی نہیں آئی ہے اور اس کی ایک روشن خیال اور معاشی وسیاسی طور پر ترقی یافتہ سماج کے قیام کی راہیں بھی متعین نہیں کی جا سکی ہیں ہماری معاشی وسماجی ترقی میں رکاوٹ اس لیئے نہیں ہے کہ ہمارے معاشی وسائل محدود ہیں بلکہ اس اسکی کی اصل وجہ یہ ہے کہ یہاں اقتدار جاگیرداروں، سرمایہ داروں اور فوجی اسٹیبلشمنٹ کے پاس رہا ہے جن کے مفادات عالمی سرمایہ داری وسامراج سے وابستہ ہیں اور جن کی موجودگی ہی سامراجی نظام کو تقویت اور ترقی پذیر ممالک کی پس ماندگی کا سبب ہے۔ ہمارے اس معاشی ڈھانچے کو جوں کا توں رکھنے اور اس کو تحفظ دینے کے لیے ہماری انتظامی مشنری بھی اسی مناسبت سے اتنی ہی سامراج نواز رکھی گئی ہے تا کہ بائیں بازو ترقی پسند وقوم پرست، درمیانے درجے کے دانشور ومحنت کار عوام کی پرتیں اور حقیقی جمہوری قوتیں اتحاد قائم کر کے کوئی مثبت تحریک پیدا نہ کر لیں جس سے سامراجی مفادات پر چوٹ پڑتی ہوا اور سماجی ڈھانچے میں تبدیل نہ ہو جائے۔

بین الاقوامی طور پر آج دنیا ایک سمتی (unipolar) کے بجائے کثیر السمتی (Multipolar) ہوگئی ہے BRICS کے قیام نے پیٹرو ڈالر کی بنیاد پر سامراجی معیشت میں بحران پیدا کر دیا ہے نتیجتاً سامراجی بربریت عروج پر ہے، سامراجی ممالک کی ننگی جارحیت سے عراق، لیبیا، شام میں حکومتوں کی تبدیلی، امریکہ کا فوج کشی کے ذریعے وینزویلا کے منتخب صدر مادورو اور ان کی بیگم کا اغوا اور وہاں کی تیل کی دولت پر مکمل قبضہ، امریکہ اور اسرائیل کی طرف سے لبنان، فلسطین، غزہ میں تباہی اور انسانی نسل کشی، ایران پر بغیر کسی جواز کے فوج کشی و تباہی و بربادی، یہ آج کی بین الاقوامی سامراجی سیاست ہے اور پاکستان کے حکمران ان کے پسندیدہ اتحادی ہیں۔

پاکستان میں جیسے کہ پہلے کہا ہے اندرونی طور پر معیشت وسیاست پر بڑے زمین داروں، سرمایہ داروں اور فوجی اسٹیبلشمنٹ کا قبضہ ہے۔ جاگیرداری اور بڑی زمیندارانہ باقیات کے خاتمے اور زرعی زمین کسانوں، ہاریوں، بزگروں اور کھیت مزدوروں میں تقسیم کرنے کے بجائے لاکھوں ایکڑ سرکاری زمین بھی فوج کو الاٹ کر دی گئی ہے اور وہ ملکی و بیرونی کمپنیوں کو ٹھیکے پر دیں گے۔ ملک سامراجی قرض غلامی میں ڈوبا ہوا ہے۔ عوام اپنی زندگی کے انتہائی بنیادی حقوق تعلیم صحت ملازمت اور رہنے کی چھت سے محروم ہیں، آئینی طور پر 16 سال کی عمر تک تعلیم کے حق کے باوجود ڈھائی کروڑ بچے اسکولوں سے باہر ہیں۔ مہنگائی عوام کے لیے ناقابل برداشت ہے۔ اٹھارویں آئینی ترمیم کے باوجود مختلف قوموں اور صوبوں کے وسائل پر مرکز کا قبضہ ہے۔ جمہوری حقوق ناپید ہیں، ہزاروں افراد بغیر کوئی مقدمہ قائم کیئے غائب ہیں، پریس پر پابندیوں کے سیاہ قوانین نافذ ہیں، عام انتخابات میں Form 47 کے ذریعے حقیقی نمائندوں کو محروم کر کے ہائبرائڈ رجیم قائم کر دی گئی ہے۔

دوسری طرف عوامی سطح پر بائیں بازو ترقی پسند وقوم پرست سیاسی جماعتیں جو اس سارے ملکی اور بین الاقوامی نظام سے نالاں ہیں اُن میں یک جہتی کا فقدان ہے، پاکستانی سیاست کے مختلف ادوار میں قوم پرستوں اور بائیں بازو و ترقی پسندوں نے مختلف سیاسی اتحاد قائم کیے مگر آج سوچنے کی ضرورت ہے کہ یہ اتحاد کیوں کامیاب نہ ہو سکے یا مستقل قائم نہ رہ سکے۔ گو کہ انہی مسائل کا آج بھی سامنا ہے۔ ترقی پسندوں اور حقیقی جمہوری قوتوں کے اہداف آج بھی وہی ہیں جن کے لیے پاکستان کے قیام سے لے کر آج تک جدوجہد کر رہے ہیں، آج بھی پاکستان کے سیاسی منظرنامے پر ان ہی بنیادی مقاصد کو زور وشور سے عام کرنے کی ضرورت ہے کیوں کہ حکمران طبقات کی سیاسی قوتیں موجودہ معاشی وسیاسی بحران کا نہ سنجیدہ تجزیہ اور نہ ہی اس سے نکلنے کے لیے ٹھوس پروگرام پیش کر سکتے ہیں، ہماری جدوجہد کے پروگرام یا بنیادی نکات مندرجہ ذیل ہو سکتے ہیں۔

1- اسٹیبلشمنٹ کی معاشی وسیاسی بالادستی کا خاتمہ

2- قومی جبر کا خاتمہ، پاکستان کو کثیر القومی ریاست تسلیم کرنا

3- مذہب کی ریاست سے علیحدگی اور تمام مذہبی اقلیتوں کا سیاسی ومعاشی تحفظ

4- بنیادی زرعی اصلاحات کے ذریعے جاگیری باقیات اور بڑی زمینداریوں کا خاتمہ، زمین کی کسانوں/ مزارعوں/ ہاریوں کھیت مزدوروں میں تقسیم اور مربوط زرعی ترقیاتی معاشی پالیسی جاری کرنا۔

5- سرمایہ داری کا خاتمہ اور اشتراکیت پذیر معاشی نظام کا قیام، سامراجی بالادستی اور قرض غلامی کا خاتمہ، آزاد خارجہ پالیسی اور پڑوسی ملکوں سے دوستی اور معاشی تعلقات کا قیام۔

6- صنفی جبر کی تمام صورتوں اور پدرسری نظام کا خاتمہ

7- تمام محنت کش اور محنت کار عوام کو ان کی زندگی کے بنیادی حقوق یعنی تعلیم صحت، روزگار اور رہنے کی چھت کے حقوق کی ضمانت

نیولبرل ترقی، اور موسمیاتی تبدیلی کے نتیجے میں ماحولیات کی تباہی کی روک تھام۔

عوامی ورکرز پارٹی سمجھتی ہے کہ ماضی کے تمام اتحاد وجدوجہد کے تجربات کو سامنے رکھتے ہوئے آج بھی اس ملک کے بائیں بازو ترقی پسند، قوم پرست سیاسی پارٹیوں، مزدوروں، کسانوں ہاریوں، طالب علموں، نوجوانوں اور سماجی تبدیلی پر یقین رکھنے والی تمام قوتوں کو ایک ایسے متحدہ محاذ کے قیام پر غور کرنے کی ضرورت ہے جو قلیل وطویل مدت کے لیئے اپنے اہداف مقرر کرتے ہوئے بنیادی سماجی تبدیلی کی جدوجہد کو منظم کرے۔ اس سلسلے میں غور کرنے کے لیے ایک ایسا اجلاس منعقد کیا جا سکتا ہے۔ امید ہے آپ اس پر غور کریں گے اور عملی اقدام کے لیے راہنمائی کریں گے۔ ☆☆

کامریڈ حسن ناصر کے تعزیتی ریفرنس کی جھلکیاں

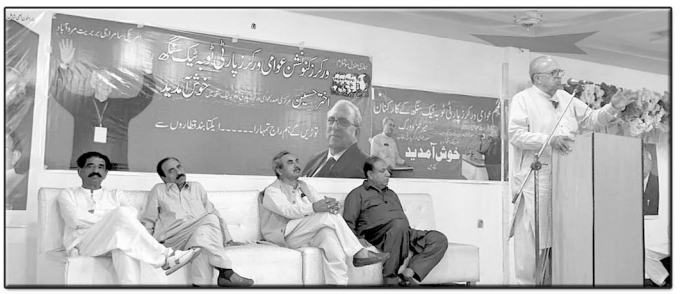

عوامی ورکرز پارٹی ٹوبہ ٹیک سنگھ کی ضلعی کانفرنس سے مرکزی صدر اختر حسین کا خطاب

کراچی کمیٹی کے اجلاس کا ایک منظر

مرکزی وومین سیکریٹری عابدہ لیاقت و دیگر شرکاء کا یوم مئی سے خطاب

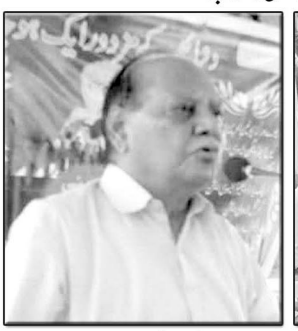

شوکت حیات کا کینٹ اسٹیشن پر یکم مئی کے جلسہ سے خطاب

مرکزی خزانچی کامریڈ زاہد پرویز کی لاہور کے مزدوروں کے وفد سے ملاقات

سانگھڑ میں مزدور ریلی

مہنگائی کے خلاف عوامی ورکرز پارٹی کراچی کا مظاہرہ

مرکزی صدر اختر حسین کی کراچی میں ایک وفد سے ملاقات

سانگھڑ میں یکم مئی کی تیاری

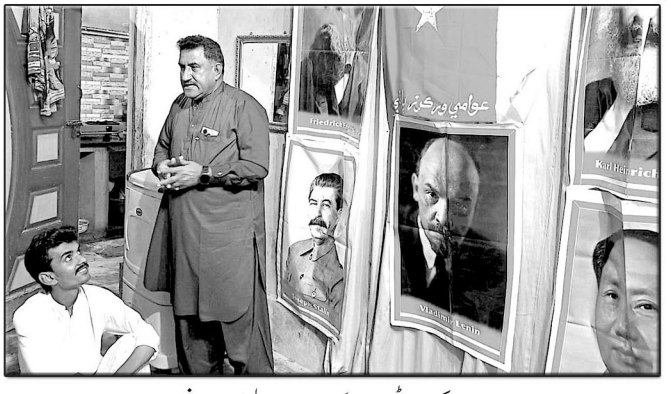

عوامی ورکرز پارٹی سندھ کے صدر کامریڈ علی نواز نظامانی کا خطاب

عوامی ورکرز پارٹی کے فیڈرل کمیٹی کے اجلاس کی جھلکیاں (مورخہ 4/اپریل 2026ء، منعقدہ لاہور)

کمیونسٹ پارٹی برطانیہ کے جنرل سیکریٹری کامریڈ الیکسی گورن اور عوامی ورکرز پارٹی کے پرویز فتح اور دیگر شرکاء

کامریڈ نصرت بشیر ظفر کا یوم مئی سے خطاب